مشہور شاعر مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی سرگزشت



داستانِ یگانہ

داستانِ یگانہ



مشہور شاعر مرزا یاس یگانہ چنگیزی کی سرگزشت

مرتبہ:
آغا امیر حسین

آغا امیر حسین

کلاسیک ناشر

چوک ریگل۔ ۴۲ دی مال لاہور۔ ۵۴۰۰۰

فون: 37312977 فیکس: 37323963

E-mail:classicpublisher@yahoo.com

E-mail:classicpublisher@hotmail.com

www.classicpublishers.com

جملہ حقوق محفوظ

O اگست 2010ء O قیمت: -/175 روپے

طابع:

سید ندیم حسین آغا

سپوتنک پرنٹرز

13-C فیض روڈ لاہور

موبائل: 0300-4442227

فون: 92-42-37355957

ای میل: nadeemagha8@hotmail.com

داستانِ یگانہ

ڈاکٹر انور سدید

مرزا واجد حسین یگانہ جن کی شعری تصانیف میں نشترِ یاس، چراغِ سخن، آیاتِ وجدانی، ترانہ اور گنجینہ کو بہت شہرت حاصل ہے، عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ لیکن ان کی سیمابی مزاج نے ان کی تنک تابی کو ہوا دی اور وہ شہر نوردی پر آمادہ ہو گئے۔ بنارس پہنچے، الہ آباد گئے، اجمیر میں ٹھہرے، دہلی سے گزرے۔ پھر لکھنؤ کو وطن بنالیا۔؟؟ نجیب آبادی نے لاہور میں اردو مرکز کے نام سے اشاعتی ادارہ بنایا تو کتابوں کی زبان کی اصلاح کے لیے یگانہ کو لاہور بلا لیا۔ لیکن اپنے مزاج کی تلخی اور اس کے شعری اظہار پر انہیں اہلِ لکھنؤ کے سوشل بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر یگانہ اپنی روش پر قائم رہے اور پاکستان آ گئے۔ ویزا کی مدت ختم ہو گئی تو لاہور میں زیرِ حراست لے لیے گئے۔ آخر بڑی تگ و دو سے واپس لکھنؤ چلے گئے جہاں ان کی توہین و تذلیل کے سامان فراہم کیے گئے تھے۔ اہلِ شہر ان کے اتنے مخالف ہو گئے تھے کہ جلوسِ رسوائی نکالا گیا۔ مرزا ہر رسوائی کا سامنا کر رہے تھے مگر تابکے۔ آخر ایک دن سوتے سوتے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ "یگانہ آرٹ" ان کی یادگار ہے جو ان کی شاعری کی کتابوں میں بھرا پڑا ہے اور "غالب شکنی" ان کا طرۂ امتیاز ہے جو ان کے نام کے ساتھ ان کے تخلص کی طرح پیوست ہے۔ ان کی وفات پر ان کے شاگرد دوارکا داس شعلہ نے مولانا ابوالکلام آزاد سے درخواست کی کہ اگر آپ کی وساطت سے حکومت صرف ان کا مزار اور احاطہ پختہ بنوا دے تو فی الحال کافی ہے۔ میری خواہش ہے کہ ان کا نشان باقی رہے۔" لیکن کہا جاتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس خط کا جواب نہ دیا۔

یہ اجمال اردو کے اس بے نظیر شاعر یگانہ کا ہے جو اپنی چنگیزیت پر فخر کرتا تھا اور

ساری عمر اپنی انا کا پرچم بلند رکھا۔ ان کی داستان عبرت ناک بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ جناب ڈاکٹر ساجد امجد نے اس داستان کو اپنے مرصّع اسلوب میں قلمبند کیا ہے اور ماہنامہ ''سرگزشت'' میں اپریل 1999ء میں شائع کی تھی۔ ادارہ ''کلاسیک'' کے ادب دوست ناشر، آغا امیر حسین مرزا یاس چنگیزی یگانہ کی افسانوی زندگی سے واقف تھے۔ یگانہ کی ایک کتاب ''آیاتِ وجدانی'' کا ایک نسخہ انہیں کراچی سے علی حسن نے فراہم کیا۔ یہ کتاب 1923ء میں لاہور سے چھپی تھی۔ یگانہ کی شاعری پر مرزا مراد بیگ شیرازی اور محسن احسان کا مقالہ ''یگانہ کا کول میں'' اور کچھ ''وقت کلیات یگانہ کے ساتھ'' بھی دستیاب ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے ماہنامہ ''سپوتنک'' کا ایک شمارہ یگانہ پر پیش کرنے کا ارادہ کرلیا اور مشفق خواجہ سے مدد چاہی جو ان پر تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ لیکن مشفق خواجہ مدد فراہم کرنے سے پہلے وفات پا گئے۔ آغا امیر حسین نے اپنے متذکرہ منصوبے کے تحت ہی اب یہ کتاب ''داستانِ یگانہ'' پیش کی ہے۔

اس کتاب میں ڈاکٹر ساجد امجد کا طویل مضمون یگانہ کی زندگی کو داستانی انداز میں سامنے لاتا ہے۔ اس لمبے لمحے کی داستان کو ایک رواں فلم سمجھئے جو ہمارے سامنے مرزا یگانہ کا ڈرامہ حرکت و حرارت کے ساتھ پیش کر رہی ہے۔ مرزا مراد بیگ شیرازی اور محسن احسان کو مضامین میں بھی یگانہ کی روح زندہ نظر آتی ہے۔ آخر کے چار ابواب میں ''نشترِ یاس'' — ''آیات وجدانی'' — ''ترانہ'' اور ''گنجینہ'' سے اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے اور کریڈٹ مشفق خواجہ کو دیا گیا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کلیات یگانہ شائع کی تھی۔ ضخامت کے لحاظ سے 144 صفحات کی یہ کتاب چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن معنویت کے لحاظ سے بے حد جامع کتاب ہے اور یگانہ کی زندگی اور ان کی شاعری کے سب گوشوں کی نقاب کشا ہے۔

ترتیب

کچھ اس کتاب کے بارے میں

جناب علی حسن (مرحوم) ڈائریکٹر انفارمیشن ڈویژن ہمدرد (وقف) ناظم آباد کراچی نے ازراہ محبت بہت عرصہ پہلے مرزا یاس یگانہ کی مشہور و معروف نایاب کتاب۔ ''آیاتِ وجدانی'' کی ایک فوٹو کاپی مجھے عنایت کی تھی۔ اس سے پہلے یاس یگانہ کی شاعری کا چرچا تو بہت سنا تھا۔ لیکن کوئی مجموعہ کلام ہاتھ نہ لگا تھا۔ ''آیات وجدانی'' پہلی بار 1923ء میں لاہور شہر ہی سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں شاعری اور اس کے حوالے سے محاضرات مرزا مراد بیگ شیرازی شامل تھے یہ محاضرات بہت دلچسپ اور تفصیل سے تحریر کئے گئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرزا یاس یگانہ نے محاضرات کی تشریح کے لئے ''آیاتِ وجدانی'' لکھی ہیں۔ بہر حال مجھے مرزا یاس یگانہ کی دوسری تحریروں کی جستجو رہی۔ اس سلسلے میں مشفق خواجہ صاحب سے کراچی میں رابطہ کیا اور ان سے راہنمائی کی درخواست کی۔ جواب میں خواجہ صاحب نے لکھا کہ میں ان دنوں علیل ہوں۔ جیسے ہی صحت میسر آئی۔ یاس یگانہ چنگیزی پر سیوتنک کا ایک شمارہ ترتیب دے دوں گا۔ افسوس کہ مشفق خواجہ صاحب ہم میں نہ رہے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اللہ تبارک تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ (آمین)۔ اس عرصہ میں چند تحریریں مزید جمع کر چکا تھا جو موجودہ شمارے میں پیش کی جارہی ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب کی کاوش ''کلیاتِ یگانہ'' بھی پیشِ نظر رہی۔ اس سے ہم نے یاس یگانہ کے کلام کے انتخاب میں مدد لی۔ جس کے لئے ہم مشفق خواجہ مرحوم اور ناشر کے شکر گزار ہیں۔

قارئین کرام! نوٹ فرمالیں اس بار شذرات ''مشنری اسکولوں کی لوٹ مار'' صفحہ 145 پر شائع کئے جارہے ہیں اور ڈاکٹر عبدالقدیر کا ایک اہم مضمون ''تخت یا تختہ'' صفحہ 151 پر ملاحظہ فرمایئے۔ شکریہ۔

آغا امیر حسین

مدیر

rekhta.org

احوال وتاثرات

سوانحی خاکہ

نام.........مرزا واجد حسین تخلص.........یاس۔ یگانہ

ولدیت.........مرزا پیارے پیدائش.........۱۸۸۳ء عظیم آباد

اولاد.........بلند اقبال بیگم، مریم آغا جان، حیدر بیگ

وفات.........۳/۴ فروری ۱۹۵۶ء تدفین.........لکھنؤ

تصانیف

نشترِ یاس، چراغِ سخن، آیاتِ وجدانی، غالب شکن، ترانہ اور گنجینہ

در مدحِ خود

ہندوستان کی ادبی دنیا میں بیسویں صدی کا سخن ور علی الاطلاق تنہا شاعر، آرٹسٹ اور GENIUS مرزا یگانہ کے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں سکتا۔

(دیباچہ آیاتِ وجدانی)

در حالِ خود

بے ہودہ خطا بھی ودیعتِ فطرت ہے مگر اس امر میں میری فطرت طلبِ عفو سے متنفر رہی ہے۔ اپنی خطاؤں پر معافی مانگنے کا خیال (اگر فی الواقع کوئی خطا میری نگاہوں میں ثابت بھی ہو جائے) میرے نفس پر نہایت گراں گزرتا ہے۔ معافی مانگنا میرے نزدیک نہایت مذموم بات ہے۔ خطا اگر ہو گئی تو اس کی سزا بھگت لینا ہی بہترین عمل ہے کیونکہ معافی

مانگنے سے روح ذلیل اور سزا بھگت لینے سے پاک ہو جاتی ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ آخر معافی مانگنے کا خیال میرے نفس پر گرانی کیوں کرتا ہے۔ آخر کو پتا یہ چلا کہ یہ بھی مغلوں کا ایک طبعی خاصہ کے تحت اپنی خطا پر معافی مانگنے کا خیال نفس پر گراں گزرتا ہے۔

غزل

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

دامنِ یوسف ہی بھڑکاتا رہا
عشق اور ترک ادب اچھی کہی

کون سمجھائے کہ دنیا گول ہے
آپ نے جیسی سنی ویسی کہی

کوئی ضد تھی یا سمجھ کا پھیر تھا
من گئے وہ میں نے جب الٹی کہی

دوست سے پردہ کیا، یہ کیا کیا
آپ بیتی چھوڑ جگ بیتی کہی

شک ہے کافر کو مرے ایمان میں
جیسے میں نے کوئی منہ دیکھی کہی

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے
ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

مفت میں سن لی یگانہ کی غزل
ان سنی کر دی جو مطلب کی کہی

غزل

خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آ نہ گیا
گناہِ زندہ دلی کہیے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا
پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا
بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا
کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

تاثرات

مجنوں گورکھپوری

یگانہ، آتش و غالب کا ایک نہایت صحت بخش امتزاج ہیں۔ ان کے کلام میں گمبھیر قسم کی مردانگی ہے وہ آتش کی یاد دلاتی ہے اور مفکرانہ بلاغت اور عارفانہ آگاہی ہے وہ غالب کے رنگ کی چیز ہے مگر یگانہ مقلد کسی کے نہیں۔ انہوں نے غزل میں واقعی بت شکنی کی ہے اور روایتی موضوعات اور اسالیب دونوں سے انحراف کر کے ہم کو غزل کی امکانی وسعتوں سے آگاہ کر دیا ہے۔

عبادت بریلوی

یگانہ کے مزاج میں فلسفیانہ گہرائی ہے۔ وہ زندگی کے مسائل پر مفکرانہ انداز میں غور کرتے ہیں اور حیات و کائنات کی بنیادی اور اہم حقیقتوں کو اپنی غزلوں میں وسعت اور گہرائی پیدا کی ہے لیکن اس کی وسعت اور گہرائی نے غزل کی روایت کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اسی لیے ان کا ہر خیال غزل کے سانچے میں ڈھل کر نکلتا ہے۔

آلِ احمد سرور

لکھنؤ اسکول سے ردِ عمل کے طور پر ان کے یہاں بے چارگی کے خلاف بغاوت ضرور ملتی ہے مگر اسے فرحت بخش نہیں کہہ سکتے۔ طاقت سے زیادہ ان کے یہاں اکڑ ہے۔ یہ حریم حسن میں بھی اپنے آپ کو بھلا نہیں سکتے۔ ان کے یہاں نہ وہ مردانگی ہے جو جوشؔ میں ہے۔ نہ وہ رعنائی ہے جو حسرتؔ میں ہے۔ نہ وہ نفاست ہے جو اصغرؔ کے یہاں ہے۔ نہ وہ مستی جو جگرؔ کے یہاں ہیں۔ نہ وہ ندرت جو اقبالؔ میں ہے۔ یہ اپنے آپ کو اتنا لیے دیے رہتے ہیں اور ان میں طنزیاتی روح اس قدر نمایاں ہے کہ یہ ان کی شعریت پر برا اثر ڈالتی ہے۔

قدرت نقوی

یگانہؔ ذہین و طباع تھے۔ زبان کے معاملے میں وہ احتیاط برتتے تھے۔ محاورے اور روزمرہ کی پابندی بھی ان کے ہاں ملتی تھی۔ وہ ایک معتدل زبان لکھتے تھے۔ ایسے الفاظ بھی استعمال کرتے تھے جنھیں اہلِ لکھنؤ استعمال کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

راہی معصوم رضا

یگانہؔ کے یہاں خودی وہ تنہا مینار ہے جو بے خودی کے کسی تاج محل سے ہم آہنگ نہیں۔ اس مینار کی عظمت سے انکار نہیں مگر یہ عظمت ایک خطرہ بھی ہے اور ایک المیہ بھی۔ یگانہؔ کے یہاں انفرادیت سے انانیت تک کی ہر منزل نظر آجاتی ہے۔ یہ انانیت گہری ہے۔ لیکن اپنی گمراہی کے باوجود سستی تقلید سے بہتر ہے۔

یہ ایک دلدوز واقعہ ہے۔لیکن یگانہ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ میں اپنے آپ کو اُن خوش نصیبوں میں سمجھتا ہوں۔ جسے ایک بہت ہی محدود اور مخصوص نشست میں یگانہ کو مسلسل ترنم کے ساتھ کلام سننے کا اتفاق ہوا۔اور میرے لیے یہ یاد اور نہایت ہی خوبصورت اور دلکش یاد ہے جو ابھی تک ذہن میں تروتازہ ہے۔

داستانِ یگانہ

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر ساجد امجد

ریل کا انجن کچھ دیر خاکِ لکھنؤ کو چوم چوم کر چلتا رہا اور پھر یوں ٹھہر گیا جیسے احتراماً رک گیا ہو۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اور اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد کہ یہی لکھنؤ کا اسٹیشن ہے، گاڑی سے اُتر گیا۔درمیانے قد کے اس نوجوان کا بدن چھریرا تھا۔پیشانی کو تنگ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن کشادہ بھی نہیں تھی۔رنگ بہت گہرا سانولا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں جو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی مسکرا رہی تھیں۔اچکن کے دامن کو درست کرتے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔راستے میں اس نے سر پر جمی ہوئی ترچھی ٹوپی کو مزید ترچھا کیا چال میں بانکپن کا انداز نمایاں تھا۔

''کہاں تشریف لے جایئے گا، حضرت!'' یکے والے نے اس کے نزدیک آ کر پوچھا۔

''اگر مناسب دام لو گے تو ہم نخاس جائیں گے۔ کیا کہتے ہو، چلو گے؟''

نوجوان کہا۔

''آپ تشریف تو رکھیں، غلام دام بھی عرض کر دے گا۔''

نوجوان نے اس کی پیش کش پر یکے میں پاؤں رکھ دیے۔ یکے کو جنبش ہوئی اور پھر نرم ہوا کی طرح چل پڑا۔

''حضور، مہمان ہوں گے؟''

''کم و بیش۔ عظیم آباد سے چلا آ رہا ہوں۔''

''حضور کے چلے جانے کے بعد حضور کو کس نام سے یاد کروں؟''

''مرزا واجد حسین!''

''عظیم آباد سے آئے ہیں تو شاعر بھی ہوں گے۔''

''جی ہاں۔ یاسؔ تخلص کرتا ہوں۔''

جوانی گزر چکی تھی لیکن لکھنؤ کا شباب اب بھی قائم تھا۔ مصفا سڑکوں پر چلتے پھرتے انسان، دھیمے لہجے معطر زبان گزرے موسم کی روایات کے امین تھے۔ پکی زمین پر یکے دوڑ نہیں رہے تھے، نزاکت سے چل رہے تھے۔ دکان دار سراپا تقریر، راہ گیر سراپا تصویر۔ مکان سراپا نور، رشک بلور۔ شہ نشینوں پر چھتیں پڑی ہوئیں، چھتوں کے ادھر قیامتیں کھڑی ہوئیں۔

باتوں اور نظاروں میں فاصلہ کٹ گیا۔ نخاس آ گیا تھا۔ یہیں اسے اترنا تھا۔

''بس بھائی، یہیں روک دو'' اس نے کرائے کے پیسے ادا کیے، چمڑے کا ایک بڑا تھیلا اس کی متاع تھا، اسے اٹھایا اور پیدل چلتا ہوا ایک گلی میں مڑ گیا۔

اس نے کرائے کے مکان کا پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا۔ یہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد اسے کوئی راستہ تلاش کرنا تھا۔

لوگ اپنے قیام کے لیے کسی شہر کے کسی محلے یا کسی محلے کے کسی گھر کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ عجیب مسافر ہندوستان بھر کے شہروں میں ایک شہر کا انتخاب کرنے گھر سے نکلا تھا۔ ایک ایک شہر سے پوچھتا پھر رہا تھا، ہے کوئی جو اسے سکون کے دن اطمینان کی راتیں عطا کر سکے۔

عظیم آباد کے محلے مغل پورہ میں اس کی آبائی قیام گاہ تھی۔ وہیں وہ پیدا ہوا، جوان ہوا لیکن اب اسی شہر کی آب وہوا اس کے لیے دشمنِ صحت ہوگئی تھی۔

اس کے اجداد کو خدماتِ شاہی کے صلے میں سرکار دہلی کی طرف پرگنہ حویلی عظیم آباد میں چند جاگیریں عطا ہوئی تھیں۔ انہی جاگیروں میں ایک موضع رسول پور بھی تھا جو وراثتاً اس تک پہنچا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے اس کے عزیزوں کو اس طرح منتشر کر دیا کہ پھر کسی کو کسی کی خبر نہ رہی۔

جب وہ جوان ہوا تو اس کے عزیزوں کی طرح اس کی صحت بھی اس سے بچھڑنے لگی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہاں کی آب وہوا اسے راس نہیں آرہی ہے۔ دولت اور جاگیریں رخصت ہوئیں تو اس شہر کو اس کا وجود بھی برداشت نہ ہوا۔ آب وہوا ایسی مخالف ہوئی کہ جان پر بن آئی۔ لوگ کرائے پر مکان ڈھونڈتے ہیں، یہ کرائے پر ایک شہر تلاش کرنے عظیم آباد سے نکل کھڑا ہوا۔

وطن کو یوں جبراً خیرباد کہنے کا دکھ وہی جان سکتے ہیں، جنہوں نے وطن سے عشق کیا ہو۔ اسے اپنے وطن سے عشق تھا اس لیے بھی کہ یہاں اس کے پیاروں کی قبریں تھیں اور اس لیے بھی کہ یہ شہر زمانہ قدیم سے ادبی مرکز تھا۔ بیدلؔ جیسا شاعر اسی خاک سے تعمیر ہوا تھا جس کے طرز میں ریختہ کہنے پر غالب کو فخر تھا۔

طرزِ بیدلؔ میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہی وہ شہر تھا کہ میر انیس لکھنؤ سے باہر کسی شہر میں مجلس پڑھنا کسرِ شان سمجھتے تھے لیکن جب پہلے پہل لکھنؤ سے باہر نکلے تو اسی شہر عظیم آباد کو رونق بخشی۔ سخن فہمی وقدر دانی کے ایسے قائل ہوئے کہ ہر سال مجلس پڑھنے آتے اور کئی کئی ماہ قیام کرتے رہے۔ وہ انیس جو ہر دم آہ سرد بھر کے کہتے تھے، ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں۔ اگر بہلتے تھے تو عظیم آباد آ کر۔

یہاں اس کے استاد شاد عظیم آبادی تھے جن سے وہ مشورۂ سخن کرتا تھا۔ ان دلچسپیوں اور احساسِ فخر کو ٹھکرا کر وہ کبھی نہ جاتا لیکن مجبوری تھی۔

بنارس پہنچا، الٰہ آباد گیا، اجمیر میں ٹھہرا، دہلی سے گزرا پھر عظیم آباد پہنچ گیا۔ طبیعت پھر بھی نہیں سنبھلی۔ اب ایک اور ادبی مرکز لکھنؤ رہ گیا تھا لہٰذا وہ لکھنؤ آ گیا۔

سفر کی تھکن اتارنے کے بعد جب اس کے مکان سے دھوپ رخصت ہوئی تو اس نے پانچوں کپڑے درست کئے اور شامِ اودھ سے لطف اندوز ہونے گھر سے نکل گیا۔ نخاس کی رونق کیا کم تھی کہ چوک سے گزر ہوا۔ اجنبی چہروں پر شناسائی کی رمق سے آمنا سامنا ہوا۔ تہذیب کے مرقعے نظر آئے۔ دہلی، منجھی زبان سننے کو ملی۔ طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ ارادہ کرلیا کہ وہ لکھنؤ کو مستقر بنائے گا۔ یہاں ہم مسلک بھی ہیں، ہم مزاج بھی، خوب گزرے گی۔

طبیعت کا اضمحلال جاتا رہا، افسردگی دور ہوگئی۔ وہ ہشاش بشاش ہوگیا۔ چند روز میں ایسا افاقہ ہوا جیسے بیمار تھا ہی نہیں۔ اطبا سے ملا، ڈاکٹروں کو دکھایا۔ سب کا یہی خیال تھا کہ یہاں کی آب وہوا آپ کو راس آ گئی ہے۔ قیام کو طول دیجئے۔ طول دینا کیا معنی، وہ تو عروسِ لکھنؤ کا اسیر ہو چکا تھا، مستقل قیام کا ارادہ کرلیا۔

لکھنؤ کی آب وہوا کا احسان تھا کہ اسے دوبارہ زندگی ملی تھی۔ زندگی کا سلسلہ بحال رکھنے کے لیے ملازمت کا وسیلہ بھی ضروری تھا۔ وہ اکیلا تھا لیکن بھوک تو اکیلے کو بھی لگتی ہے۔

وہ انٹرنس پاس تھا، انگریزی جانتا تھا بلکہ اتنی انگریزی جانتا تھا کہ لکھنؤ آنے سے قبل مٹیا برج میں راجہ علی شاہ کے پوتوں کی انگریزی تعلیم پر مقرر رہا تھا۔ فارسی اور عربی سے بھی واقف تھا۔ درسیات کی تکمیل اسکول سے بھی ہوئی تھی نیز اپنی ذاتی لیاقت سے، بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ مطلب یہ کہ ملازمت کے لیے جس تعلیم کی ضرورت تھی، وہ اس کے پاس تھی، ذرا سی کوشش کے بعد ایک انگریزی دفتر میں ملازمت مل بھی گئی۔

وہ اس ملازمت سے مطمئن نہیں تھا لیکن وقت گزاری کے لیے، بہت تھی۔

وہ خود لکھنؤ میں مستقل ہو گیا تھا لیکن ملازمت مستقل نہیں تھی۔ کچھ اس کی طبیعت میں اضطراب بھی تھا۔ یکے بعد دیگرے کئی انگریزی دفتروں میں عارضی ملازمتیں کرتا رہا۔

معاش کی طرف سے قدرے بے فکری ہو جانے کے بعد اس نے مشاعروں کا رخ کیا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی شاعر لکھنؤ آئے اور لکھنؤ کے شاعر اسے تلاش نہ کر لیں اور اسے مشاعروں تک نہ لے جائیں۔

مشاعروں کی بہار اب خزاں آلودہ ہو گئی تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ مہینے میں دو تین مشاعرے پھر بھی ہو جاتے تھے۔ ان مشاعروں میں میاں صفی، میاں عزیز، ثاقب، محشر وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا۔ مشاعروں کی چہل پہل سے قطع نظر، اردو غزل زوال آمادہ تہذیب کی نمائندگی کر رہی تھی۔ الفاظ و معانی میں ابتذال اور بے احتیاطیوں کا رواج عام تھا۔ کوئی رعایتِ لفظی کا دلدادہ، کوئی چاہِ ذقن میں ڈوب مرنے کو آمادہ۔ کسی کو مبالغہ آرائی پر ناز، کوئی تخیل کے ساتھ خود بھی محوِ پرواز۔ یہ طے کر لیا تھا کہ شعر میں رونے پیٹنے، موت، گورِ غریباں کے مناظر اور معشوق و فلک کے نازل کیے ہوئے مصائب و مظالم کے بیان میں اثر محدود ہے۔ جب تک یہ مضامین نہ ہوں شعر پُر تاثیر نہیں ہو سکتا۔

یاسؔ اسی مزار کا مجاور بن کر مشاعرے میں پہنچا۔ وہی سکے اس کی جیب میں بھی تھے جن کا چلن اس وقت لکھنؤ کے بازار میں تھا لیکن پھر بھی چونکہ وہ لکھنؤ کا نہیں تھا لہٰذا

اجنبیت برقرار تھی۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ ان مشاعروں میں مضامین کی گرفت نہیں ہوتی الفاظ پکڑے جاتے ہیں، نئے خیالات پر نہیں پرانے محاوروں پر مشاعروں میں مضامین کی گرفت نہیں ہوتی الفاظ پکڑے جاتے ہیں، نئے خیالات پر نہیں، پرانے محاوروں پر مشاعروں کی پھبتیں اڑ جاتی ہیں۔ جدت میں نہیں، اتباع میں کامیابی ہے۔

اس کے استاد شادؔ تو عظیم آباد میں تھے، اب سوال یہ تھا کہ مشورہ کس سے لیا جائے جن شعراء کی صحبت میں شریک ہو رہا ہے ان کے داؤ پیچ سیکھے تو کس سے سیکھے۔ ہر ہفتے ایک مشاعرہ ضرور ہوتا تھا۔ ان مشاعروں میں لفظوں کی بندش، محاوروں کی بھرمار اور تراکیب کی ندرت ہی کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا کلام کسی کو دکھائے۔

پیارے صاحب رشید میر انیسؔ کے نواسے تھے۔ مشاعروں کی ہنگامہ آرائی سے .ل ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ مرثیہ گو تھے لیکن غزلیں بھی کہتے تھے۔ انہیں اس عہد میں زبان کا سب سے بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا اور لوگ ان کے کلام کو سند کے طور پر پیش کرتے تھے۔

یاسؔ نے بہت غور و فکر کے بعد پیارے صاحب رشید کو اپنا کلام دکھانے کا ارادہ کیا۔

وہ ان سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اسے یہ خوشی ہو رہی تھی کہ وہ ایک ایسے شخص سے ملنے جا رہا ہے جو میر انیسؔ کے خانوادے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان کی شاعر دوستی، تہذیب اور مروت سے اسے پورا یقین تھا کہ وہ اسے مایوس نہیں کریں گے۔

چہرے پر چھوٹی داڑھی، پٹے بال۔ اچکن کے بٹن گلے تک لگے ہوئے۔ بڑے پائنچوں کا پاجامہ، پیروں میں پمپ۔ پیارے صاحب گھر میں بھی پانچوں کپڑوں سے اس طرح آراستہ بیٹھے تھے جیسے کہیں جانے کو تیار ہوئے ہوں۔ یاسؔ نے سوچا، لکھنؤ کی تہذیب اب گھروں تک محدود ہو گئی ہے۔

ایسی خوش اخلاقی سے پیش آئے جیسے برسوں کے آشنا ہوں۔ مقصد سنا تو کچھ دیر کو

خاموش ہو گئے۔

''میاں، اب مشاعروں میں یاوہ گوئی کے سوا کیا رہ گیا ہے۔ کیوں جاتے ہو، کیا حاصل کر لو گے؟''

''حضرت، یہ میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن میری شاعری کی ابتدا ہے۔ مشاعروں میں جائے بغیر کون مجھے تسلیم کرے گا؟''

''کہتے آپ بھی ٹھیک ہیں لیکن میری نصیحت ہے کہ اس طوفانِ بے تمیزی سے دامن بچا سکو تو بچا لینا۔''

یاسؔ نے غزل پیش کی۔

سلسلہ چھڑ گیا جب یاسؔ کے افسانے کا
شمع گل ہو گئی، دل بجھ گیا پروانے کا
خلوتِ ناز کجا اور کجا اہلِ ہوس
زور کیا چل سکے فانوس سے پروانے کا
وائے حسرت کہ تعلق نہ ہوا دل کو کہیں
نہ تو کعبے کا ہوا میں نہ صنم خانے کا
واہ کس ناز سے آتا ہے ترا دورِ شباب
جس طرح دور چلے بزم میں پیمانے کا

اشعار کے مضامین میں تازگی تھی۔ کوئی فنی سقم بھی نہیں تھا۔ اصلاح کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

''آپ کو کسی مبتدی کی طرح اصلاح کی ضرورت تو نہیں، ویسے میں حاضر ہوں۔ مشاعرے میں جانے سے قبل مجھے غزل سنا لیا کریں۔''

لکھنؤ کے بعض شعراء نے معیار پارٹی کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی۔ ہر

طرف اس پارٹی اور اس کے شامل ارکان کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اس کی کوششوں سے طرحی مشاعرے کثرت سے برپا ہوتے تھے۔ یاسؔ بھی ان مشاعروں میں شریک ہونے لگا۔

یاسؔ کے مزاج میں فلسفیانہ گہرائی تھی۔ وہ زندگی کے مسائل پر مفکرانہ انداز میں غور کرسکتا تھا اور حیات و کائنات کی بنیادی اور اہم حقیقتوں کو اپنی غزل میں سموسکتا تھا۔ اس مفکرانہ انداز نے اس کی غزلوں میں وسعت اور گہرائی پیدا کردی۔ وہ آہستہ آہستہ لکھنؤ کی ٹھیٹ روایت سے دور ہونے لگا۔ اس نے بازار کا بھاؤ دیکھ کر غزل کہنے کی روش کو ترک کیا۔ اس نے وہ کہنا شروع کیا جو اس کے دل پر گزرتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی پیارے صاحب کی صحبت و تربیت سے الفاظ کی بندش، محاورے کی سادگی، تراکیب کی خوب صورتی، تشبیہات کی ندرت کا بھی اس نے خیال رکھا۔

اس کی ان غزلوں نے لکھنؤ میں اپنی جگہ بنانا شروع کردی۔ دلوں پر اثر ہونے لگا۔ یہیں سے وہ سلسلہ شروع ہوا جو صاحب کمالوں کا مقدر ہوتا ہے۔ بعض شعراء حسد کی آگ میں جلنے لگے۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھے۔ ایک عظیم آبادی، لکھنؤ میں ایسی ایسی غزلیں پڑھ کر چلا جائے اور ہم دیکھتے رہیں۔ یہ شخص ہماری زبان بھی بگاڑ رہا ہے اور مزاج بھی۔ اس کے حریف صف بستہ ہوگئے۔

خواجہ حیدر علی آتشؔ کی زمین میں طرح مشاعرہ تھا۔ یاسؔ بھی اس مشاعرے میں مدعو تھا۔ خبر یہ تھی کہ تمام حریفانِ کرام اس مشاعرے میں جمع ہوں گے اور بقول کے غالبؔ کے اڑیں گے پرزے۔

اس کے گھر میں رات اتر آئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ کچھ دیر معیار پارٹی کے اراکین شعراء کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک ایک چہرہ اس کے سامنے آتا رہا۔ ان لوگوں کو مجھ سے کیا چشمک ہوگئی ہے۔ میں یہی تو کررہا ہوں کہ اردو غزل کی ترقی کے لیے کوشاں ہوں۔ اس میں میرا اپنا کون سا فائدہ ہے۔ فائدہ ہوگا تو ادب کا۔ نام ہوگا تو لکھنؤ

کا۔ مجھ سے زیادہ ان کا فرض ہے کہ یہ اس ترقی پر خوش ہوں۔ میں تو عظیم آباد کا ہوں، یہ لکھنؤ کے ہیں۔

رات کے قریب دس بجے لالٹین، اپنا مخصوص تکیہ، پانوں کی ڈبیا اور پنکھا اس کمرے میں پہنچا دیا جہاں بیٹھ کر وہ فکرِ سخن کرتا تھا۔ زمین پر فرش بچھا ہوا تھا، الماری میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے حقے کے ہلکے ہلکے چند کش لگائے اور کاغذ رکھنے کے صندوقچے سے کاغذ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیے۔ آتش کے مصرع طرح کو کئی مرتبہ دہرایا کچھ دیر گنگناتا رہا۔ پھر وہ اکیلا ہو گیا۔ نہ کمرا تھا، نہ الماری، نہ حقہ۔ اس کی گنگناہٹ تھی اور کاغذ پر چلتے ہوئے قلم کی آواز۔

صبح چار بجے کے قریب اس نے رات بھر کے کہے ہوئے اشعار کو بہ آواز بلند پڑھا اور پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔

دوسری رات ان اشعار پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے کی رات تھی۔ وہ ایک ایک شعر کو غیر کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ مصرعے بدلتے لفظوں کی کتر بیونت میں ایک رات اور کٹ گئی۔

مشاعرے کی ظاہری تہذیب وہی تھی جو لکھنؤ کی پہچان تھی۔ شعراء بالترتیب دوزانو بیٹھے تھے۔ معیار پارٹی کے تمام اراکین جمع تھے عمائدین شہر...... صف بہ صف جمع تھے۔

شروع بہار کے جھونکے کی طرح یاسؔ نے اپنی غزل شروع کی۔ نرم آواز مگر ایک جھنکار کے ساتھ مخاطب کرتے تو "بھی" "کو" "جی" کہہ کر ادا کرتے۔

فراقؔ نے ایک مرتبہ کہا تھا پورا پرشین کلچر اس کی آواز میں ہے۔ اس کا اس وقت کا پڑھنا اس رائے کو سچ ثابت کر رہا تھا۔ وہ اپنے اشعار پر خود بھی جھوم رہا تھا اور دوسروں کو بھی بے خود کر رہا تھا۔ اس کے حریف کن آنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

نہیں معلوم کیسا سحر تھا اس بت کے چتون میں
چلی جاتی ہیں اب تک چشمکیں شیخ و برہمن میں

چھپیں گے کیا اسیران بلا صحرا کے دامن میں
محبت دام کی پھر کھینچ کر لائے گی گلشن میں
کن انکھیوں سے جو ہم کو بزم میں تم دیکھ لیتے ہو
کھٹک جاتے ہیں کانٹے کی طرح ہم چشم دشمن میں
کنارِ آب جو بیٹھے ہیں مست نکہتِ ساغر
نظر سوئے فلک اور ہاتھ ہے مینا کی گردن میں
تھکے ماندے سفر کے سو رہے ہیں پاؤں پھیلائے
یہ سب مر مر کے پہنچے ہیں بڑی مشکل سے مدفن میں
حجابِ ناز بے جا یاسؔ جس دن بیچ میں آیا
اسی دن سے لڑائی ٹھن گئی شیخ و برہمن میں

اس نے بڑی جستجو سے یہ موتی، دریائے سخن سے نکالے تھے اور اسے امید تھی کہ اہل نظر انہیں آنکھوں میں جگہ دیں گے۔ اسے ان موتیوں کی داد ملی بھی لیکن ایک گروہ ایسا بھی تھا جنہوں نے اس کاوش کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ جی بھر کے فرمائشی قہقہے بلند کئے۔ ہر شعر پر ان کی طرف سے داد کے بجائے قہقہوں کا شور بلند ہوا۔

اس مشاعرے کے بعد معیار پارٹی کے ایک رکن حکیم منے آغا صاحب طاہر کے مکان پر غالبؔ کی زمین میں مشاعرہ ہوا۔ یاسؔ کو سمجھ لینا چاہیے تھا کہ موسم کیا ہے لیکن وہ اس مشاعرے میں بھی پہنچا اور یہ غزل نکالی۔

واں نقاب اٹھی کہ صبحِ حشر کا منظر کھلا
یا کسی کے حسنِ عالم تاب کا دفتر کھلا
رنگ بدلا پھر ہوا کا، مے کشوں کے دن پھرے
پھر چلی بادِ صبا پھر میکدے کا در کھلا

بند آنکھیں ہوگئیں بے تاب ہوہو کر گرے
سامنے پیاسوں کے کس نے رکھ دیا ساغر کھلا
چار دیوار عناصر پھاند کر پہنچے کہاں
آج اپنا زورِ وحشت عرشِ اعظم پر کھلا
ہاتھ الجھا ہے گریباں میں تو گھبراؤ نہ یاسؔ
بیڑیاں کیوں کر کٹیں زنداں کا در کیونکر کھلا

یہ غزل بھی پچھلی غزل کی طرح ہرگز ایسی نہیں تھی کہ اس پر خندہ زنی کی جاتی۔ مضامین روایتی تھے۔ کوئی ایسی بغاوت نہیں تھی کہ تضحیک کا نشانہ بنتی لیکن اس غزل کا بھی وہی حشر ہوا جو اس سے پہلی غزل کا ہو چکا تھا۔

”مجھے نہ کسی کی داد سے غرض ہے نہ بے داد کا شکوہ۔ کلامِ دل پذیر کسی کی داد بے داد کی پروا نہیں رکھتا“ یاسؔ نے کہا اور دامن جھاڑ کے بزم سے اٹھ گیا۔

اس مخالفت کا منشاء صرف یہ تھا کہ یہ شخص بد دل ہو کر صرف مشاعروں ہی سے نہیں، لکھنؤ سے بھی چلا جائے۔

یاسؔ پر اس سرزنش کا الٹا ہی اثر ہوا۔ وہ لکھنؤ چھوڑ کر کیا بھاگتا، اس نے تو یہاں رہنے کا مزید پکا انتظام کر لیا۔

نخاس کی ان سے شناسائی، قرابت داری میں تبدیل ہو گئی۔ ان کی صاحب زادی یاسؔ سے منسوب ہو کر، نکاح میں آ گئیں۔

یاس کی ادبی شہرت اب اتنی ہو گئی تھی کہ لکھنؤ میں وہ کسی کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔

ایک دن وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ مطبع نولکشور گیا۔ یہ لکھنؤ کا بہت بڑا چھاپا خانہ تھا۔ کتابوں کی چھپائی کا بڑا معتبر مرکز تھا۔ اتفاق سے اس مطبع میں کتابوں کی عبارت کی

درستی کے لیے کسی صاحب علم کی ضرورت تھی۔ یاسؔ کی علمیت اور اعلیٰ ذوقِ شعری سے کون واقف نہیں تھا۔ باتوں باتوں میں ملازمت کا ذکر نکل آیا۔ یاسؔ نے اس ملازمت کے لیے شوق ظاہر کیا اور یہ ملازمت اسے مل گئی۔

یہاں تنخواہ بھی مناسب تھی اور کام بھی یاسؔ کے مزاج اور شوق کے مطابق تھا۔

مخالف کی جو ہوا چلی تھی، وہ آندھی بنتی چلی جا رہی تھی۔ صفیؔ، عزیزؔ، محشرؔ وغیرہ نے اس کی زبان کو مستند ماننے سے انکار کر دیا۔ محض اس لیے کہ وہ لکھنؤ کا نہیں عظیم آباد کا تھا۔

یاسؔ دبنے والا نہیں تھا۔ وہ تو اس مزاج کا تھا کہ غلطی پر بھی معافی مانگنے کو تذلیل سمجھتا تھا۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس کا مطالعہ بھرپور تھا اور ایک حد تک جینئیس تھا۔ وہ کسی نااہل کو مردِ خدا کہنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا اہلِ لکھنؤ کی بدسلوکی کے ردِ عمل میں اس کی خودشناسی خود پرستی میں بدل گئی۔ وہ ایسے راستے پر چل پڑا جہاں اپنے سوا دوسرا نظر نہیں آتا۔

وہ دبنے کے بجائے اپنی بات پر اڑ گیا۔

"اگر تم مجھے بیرونی کہتے ہو تو ان کو بھی بیرونی کہو جن کے فیض سے تم اہلِ زبان بنے ہو۔ لکھنؤ کو مستند تو ان لوگوں نے بنایا، تم نے نہیں۔"

بس پھر کیا تھا، قیامت ہی تو آگئی۔ گروہ بندی کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یاس نے تن تنہا ان شعراء سے ٹکر لی اور ترکی بہ ترکی جواب دیے۔ اس پر ان شعراء نے یاسؔ کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس مشاعرے میں یاس مدعو ہوتا، لکھنوی شعراء اس میں شرکت نہ کرتے۔ مطلب یہی تھا کہ لوگ اسے بلانا چھوڑ دیں۔ اس سیلاب میں تنہا یاسؔ چٹان کی طرح ڈٹا ہوا تھا۔

ہر ذہین آدمی کی طرح یاسؔ کو بھی یہ توقع تھی کہ اس کے فن کو سراہا جائے گا لیکن وہ ابتدا ہی میں حریفوں کے رشک و حسد کا شکار ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سویا ہوا شعورِ برتری ضرورت سے زیادہ بیدار ہو گیا۔

یہ شعورِ برتری چونکہ رشک و حسد کے ردِ عمل سے بیدار ہوا تھا اس لیے وہ جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا۔ ضد، ہٹ دھرمی اور نرگسیت کا شکار ہو گیا۔ اس کی نفسیات ایک ایسے بچے کی نفسیات ہو گئی جو غصے میں آ کر ہر چیز کو توڑنے پھوڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اپنے کھلونوں کو بھی۔ وہ تعمیر کے راستے پر چل سکتا تھا لیکن حالات نے اسے تخریب کے کام پر لگا دیا۔ اس نے گھبرا کر اپنے خرمن میں وہ آگ لگائی کہ لکھنؤ کی شاعری کا گھر اپنی ہی آگ میں جل بجھا۔

ادب گاہ کو میدانِ حشر بنا دیا۔ جدال وقتال، ہنگامہ، شور وغل، ایک ایک حریف کو گردن سے پکڑ کر تاڑا۔ طنز، تحقیر، پھبتی، تشدد، ہر چیز سے کام لیا۔ اس ایک نے ہزار کو زخمی کر دیا۔ جس پر وار کرتا تھا وہ پھر نہ اٹھتا تھا۔ اس کے بقول، اس نے صفی اینڈ کو کی "پھڑ" کو اجاڑ کر رکھ دیا لیکن اس اجاڑ پچھاڑ کے ردِ عمل میں اٹھنے والی تحریکوں نے خود اسے کس حال پر پہنچا دیا، یہ سوچنے کا وقت ابتدا میں اس کے پاس کہاں تھا۔ ہوتا بھی تو ایک ضدی آدمی کی طرح اپنی تباہی کی قیمت ادا کر کے بھی حریف کو تباہ کر دیتا۔ خود بھی برباد ہوتا اسے بھی کرتا۔ رفتہ رفتہ زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ تھا، سب کو اپنا دشمن بنا لیا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ ان کا ایک ہاتھ مستقل پنکھا جھلنے میں مصروف تھا۔ اس کی بیوی اس کے سرہانے کی طرف بیٹھی پاندان سے پان بنانے میں مشغول تھی۔ وہ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتا، کبھی لیٹ جاتا۔

"آج آپ کو گرمی کچھ زیادہ لگ رہی ہے" بیگم نے پان کی تھالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"گرمی کے موسم میں گرمی نہیں لگے گی تو اور کیا لگے گا؟"

"آج تو آپ کو بے چینی بہت ہے۔"

"آج مجھے میاں مصحفی یاد آ رہے ہیں۔ انشا سے ہونے والے ان کے معرکے یاد

آ رہے ہیں جو کچھ میں نے پڑھا تھا، وہ اب آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ مصحفی بھی دلی سے لکھنؤ آئے تھے جس طرح میں عظیم آباد سے لکھنؤ آیا ہوں۔ اس باکمال کے ساتھ ان لکھنؤ والوں نے کیا، کیا۔ اس غریب کی رسوائی کا جلوس تک نکالا گیا۔ یہی سلوک اس شہر میں آج میرے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"ایک چپ سو کو ہراتی ہے، آپ جواب ہی نہ دیں۔ خود ہی سب چپ ہو جائیں گے۔"

"آپ اسے پڑوس کی عورتوں کی لڑائی سمجھ رہی ہیں۔ میں چپ ہو گیا تو تاریخ بولے گی۔ میر انیس نے برسرِ منبر عظیم آباد کو ٹکسال کہا تھا اور یہ میری زبان کو غیر ٹکسالی کہیں، مستند نہ مانیں اور میں خاموش رہوں؟ میں ایسے آئینے تیار کروں گا جن میں یہ اپنی شکلیں دیکھ کر ڈر جائیں گے۔"

اس کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، پنکھے والا ہاتھ تیز تیز چلنے لگا تھا "عزیز لکھنوی نے میری شاعری پر ایسے بودے اعتراضات کیے ہیں کہ میں خاموش رہ ہی نہیں سکتا۔"

"کسی کے کہنے سے کیا ہوتا" اس کی بیوی نے کہا اور چھالیا کترنے لگیں۔

"بیگم، ٹھنڈا پانی تو پلاؤ۔"

"ابھی پیش کرتی ہوں۔"

وہ ابھی اٹھنے بھی نہیں پائی تھیں کہ مرزا نے روک دیا "رہنے دو۔ میں نے کچھ اور سوچا ہے۔"

یاس نے سر پر ٹوپی رکھی، پاؤں چپلوں میں ڈالے اور باہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

"یا وحشت! اس دوپہری میں کہاں چلے؟"

''بس ذرا گول دروازے تک جا رہا ہوں۔''

چوراہے پر پہنچ کر رکشا لیا اور گول دروازے پہنچ گیا۔ وہ کہیں اور نہیں، کولڈ ڈرنک کی دکان پر آیا تھا۔

آج یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے مغل خون میں حرارت آ گئی ہے۔ یہ گرمی اس کے بدن کو جلائے دے رہی ہے۔

''میاں، بوتل لے کر آؤ مگر خوب ٹھنڈی یا پھر گلاس میں برف ڈال کر لاؤ۔''

دکان دار ایک گلاس میں برف اور بوتل کا پانی لے کر آ گیا۔ یاس نے گلاس کو چھو کر دیکھا۔

''حضور کہیں تو اور برف حاضر کروں؟''

''نہیں، اتنی ٹھنڈک بہت ہے۔''

گرمی تو کیا کم ہوتی، گھر سے یہاں تک آ کر وحشت میں کچھ کمی آ گئی تھی۔

دیکھیے کیا خدا دکھاتا ہے
آپ نازک مزاج، ہم بے باک

رات کو جب سب سونے کے لیے لیٹ گئے تو وہ حسبِ معمول اس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ فکرِ سخن کیا کرتا تھا۔ حقے کی دھیمی دھیمی گڑگڑاہٹ کمرے کے سونے پن کو توڑ رہی تھی۔ اسے پھر مصحفی اور انشا کی معرکہ آرائی یاد آ گئی۔ چلو، ایک معرکہ اور سہی۔ اس نے قلم سنبھالا اور دن بھر کے غصے کو زبان دے دی۔ نشانہ عزیزؔ لکھنوی تھے۔ اس نے ان کے ایک قصیدے پر اعتراضات کیے تھے۔ بات نکلی تو غلطیوں کے انبار لگا دیے۔ قصیدے کی تقطیع تک کر ڈالی۔ غصہ تو تھا ہی، زبان ایسی سخت استعمال کی کہ تھوڑی دیر میں عزیزؔ لکھنوی جیسے استاد، معمولی درجے کے شاعر نظر آنے لگے۔

اس نے یہ مضمون صاف کیا اور میرٹھ کے ایک رسالے ''نظارہ'' کو بھیج دیا۔ اس

دن کے بعد سے اس کی آنکھیں عجیب انداز سے مسکرانے لگی تھیں۔

مضمون کے چھپتے ہی لکھنؤ میں ہلچل مچ گئی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کبوتروں کے کابک میں بلی گھس آئی ہو۔ عزیزؔ لکھنؤ کے اساتذہ میں تھے۔ پھر ان کا گروپ بھی نہایت طاقتور تھا۔ مزید ظلم یہ ہوا کہ لکھنؤ کے شعراء نے عزیزؔ پر حملہ، لکھنؤ پر حملہ تصور کیا۔ ایک ہی دن میں مرزا یاسؔ ناپسندیدہ ترین ہو گیا۔ اب اس پر کھلا کہ اس کا معاملہ مصحفیؔ سے مختلف ہے۔ مصحفیؔ کا مقابلہ صرف انشاء اللہ خان انشاؔ سے تھا۔ اس کے لیے لکھنؤ کا ہر شاعر ایک انشاؔ ہے۔ پھر مصحفیؔ کے ساتھ تو اس کے شاگرد تھے۔ وہ تو بالکل اکیلا ہے۔ اس کا تو کوئی شاگرد بھی نہیں۔ یہ وہ مقام تھا کہ کوئی بھی ہوتا تو اس کا پتا پانی ہو جاتا لیکن اس کی ٹوپی تو اور ترچھی ہو گئی۔ مغلوں کا وتیرہ ہے کہ وہ گرفتار ہو کر بھی اماں طلب نہیں کرتے۔ میں تو پھر بھی آزاد ہوں۔ مجھے اپنے فن پر اعتماد ہے، بھونکنے والے کب تک بھونکیں گے۔

اس پر مشاعروں کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ کبھی بھولے بھٹکے جا نکلتا تو فقروں اور پھبتیوں سے استقبال ہوتا۔ وہ ہر بے عزتی کے بعد مزید اکڑ جاتا۔

دل کو لبھاتا ہے ہنگامۂ زندانِ بلا
شورِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

جب مخالفوں نے دیکھا کہ یہ یوں ماننے والا نہیں تو انہوں نے دوسرا طریقہ استعمال کیا۔

ایک دن چند شہدوں نے اسے راہ میں روک لیا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ انداز دوستانہ نہیں۔

''مرزا واجد حسین تم ہی ہو؟''

''جی ہاں۔''

''لگتے تو چڑی مار ہو۔''

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔"

"بے ہودگی تو وہ ہے جو تم نے عزیز لکھنوی کے ساتھ کی ہے۔"

"اچھا! تو یہ معاملہ ہے" یاس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "یہ ادبی معاملہ ہے، آپ لوگ بیچ میں نہ آئیں۔ ان میں دم ہوگا تو وہ خود جواب دے لیں گے۔"

"اس نے یوں برسر بازار بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا شہدے اسے خاموش دیکھ کر اپنی راہ ہو لیے۔

جس کی تلوار کا ہو لوہا تیز
جبت ناتمام کیا کرتا

وہ بڑی دیر تک ان شہدوں کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اسے یقین آ گیا کہ اس کا دشمن کتنا کمزور ہے۔ اس نے کہا، لے اور لیتا جا۔ عزیز کو نشانہ بنایا تھا، اب اس نے لکھنؤ کے دوسرے بڑے شاعر صفی لکھنوی کی خبر لے ڈالی۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اس پر تنقید کی۔

یعنی رنڈی نے غزل شروع کر دی اور آپ اب ساز ملانے چلے ہیں۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ بجانے والے ساز پہلے ملا لیتے ہیں بعد اس کے رنڈی گانا شروع کرتی ہے۔ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ صفی کی شاعری بھی انوکھی ہے اور باجا بجانا بھی انوکھا۔

ایک اور شعر کے بارے میں اس نے یہ بات پھیلا دی۔ "دوسرے مصرع کا کیا کہنا مگر شاعر نے پہلا مصرع ایسا بودا لگایا ہے کہ دوسرے مصرع کو بھی لے ڈوبا۔ اس سے زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ یہ مطلع سودا کے اس مشہور و معروف مطلع کے جواب میں کہا گیا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔"

شاعر کا اناڑی پن بھی ثابت کر دیا اور اسے سارق بھی ثابت کر دیا کہ اس نے سودا پر ہاتھ صاف کیا ہے۔

اس نے اس ہنگامۂ کارزار کو نثر پاروں تک یا گفتگو تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنی غزلوں کو میدانِ جنگ بنا دیا۔ اس کی غزل کا ہر دوسرا تیسرا شعر مخالفوں پر ضرب کاری بن کر ادا ہونے لگا۔ سمجھنے والے سمجھ جاتے تھے کہ چوٹ کس پر ہے۔ شدید نکتہ چینی اور لے دے کے انداز نے اس کی غزلوں کو میدانِ حشر بنا دیا جہاں ہر گنہ گار حاضر ہے اور وہ سزا سنا رہا ہے۔ اس کے مخالف ان شعروں کو پڑھتے اور پیچ و تاب کھاتے۔

عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو
لہو کا گھونٹ اتر جاتا ہے جب شیر و شکر ہو کر

جدائے پنجۂ خونخوار سے جو بس نہ چلے
تو بن کے خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے
میں کہاں ہار ماننے والا

منہ زوریوں کا حوصلہ سرکارِ حسن سے
آخر پڑی وہ مار کہ چہ سے ادھڑ گیا

پڑ چکے بہت پالے، ڈس چکے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

ٹکرا کے دیکھیں، تم کیا ہو ہم کیا
جیتے تو جیتے، ہارے تو ہارے

یارانِ چمن یہ رنگ و بو مجھ سے ہے
تم سے کیا ہوگا لکھنؤ مجھ سے ہے
میں جانِ سخن ہوں بلکہ ایمانِ سخن
دنیائے ادب کی آبرو مجھ سے ہے

اس نے ایک غضب یہ بھی کیا کہ لکھنؤ اسکول کی پوری غزل گوئی کو چیلنج کر ڈالا۔ درو دیوار ہی نہیں، زمین وآسمان تک بدل ڈالے۔

نزاکت اور نسائیت لکھنؤ کی غزل کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے اس غزل کو مردانہ لب ولہجہ دیا اور مرد بھی ایسا جس کے تیور ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ جس میں ایک بانکپن اور تیکھا پن ہے۔ گویا اس کی غزل میں مرد اور لہجے میں مردانگی بولنے لگی۔

لکھنؤ کے اچھے دنوں میں صرف آتش کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ اس کا لہجہ مردانہ تھا۔ اب یاس کی غزلوں میں آتش کا پرتو نظر آنے لگا تھا۔

"یہ کون حضرت آتش کا ہم زبان نکلا۔"

لکھنؤ کے مخصوص حالات نے دلوں کو افسردہ کر دیا تھا۔ اس کا عکس اس دور کی غزلوں میں بھی نظر آتا تھا۔ ناامیدی اور مایوسی کی کیفیات عام تھیں۔ یاسؔ کا مزاج ہی یہ نہیں تھا کہ وہ ناکامیوں سے نامراد ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ تو اس کا قائل ہے۔

خواہ پیالہ ہو یا نوالہ ہو
بن پڑے تو جھپٹ لے بھیک نہ مانگ

اس نے نشاط و امید کے پھول کھلا دیے۔ اس کی غزلیں منہ بسورنے کی بجائے حالات پر قہقہے لگاتی نظر آتی تھیں۔

چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم
کون سی جا ہے جہاں حکمِ خزاں جاری نہیں

ہنوز زندگی تلخ کا مزا نہ ملا
کمالِ صبر ملا صبر آزما نہ ملا

برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گم راہ ہوکر راہ پر آنا نہیں آتا

لکھنوی شاعری بلکہ پوری اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ حسن وعشق تھا۔ اس نے اس روییے پر یہ کہہ کر طنز کیا۔

وقت جس کا کٹے حسینوں میں
کوئی مردانہ کام کیا کرتا

یہی رویہ اس کا عشق کے ساتھ رہا" حقیقی شاعری کے لیے زندگی کے حقائق کیا کم ہیں کہ انہیں چھوڑ کر رومان کی طلسم بندیوں سے دل بہلایا جائے۔

اس کا کہنا یہ تھا کہ غزل گوئی عاشقانہ زندگی کی ترجمانی کا نام نہیں بلکہ یہ وہ مشکل ترین صنف ہے جس میں زندگی کے بڑے بڑے مسائل اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کرنے میں اعلیٰ درجے کی شاعرانہ قوتیں صرف ہوتی ہیں۔

اس نے لکھنؤ کی عشقیہ شاعری کو یکسر رد کر دیا۔ عشقیہ مرکز کی اس غیر موجودگی نے اگرچہ اس کے کلام سے خوش گواری چھین لی لیکن اس کا انتقام پورا ہو گیا۔ اس نے اہلِ لکھنؤ کو یہ جتا دیا کہ میں اپنے بل پر اپنا مقام بنا سکتا ہوں۔

یہ ایسی جراتِ رندانہ نہیں تھی جسے اہلِ لکھنؤ آسانی سے نظر انداز کر دیتے۔ یہ ان کے لیے بالکل نئی سی ایک چیز تھی جس کی مخالفت ہونا لازمی تھا۔ اب تک اس کی زبان کو مستند

نہیں سمجھا جاتا تھا، اب اسے شاعر ماننے سے بھی انکار کیا جانے لگا۔ یہ بات ان کے لیے عجیب سی تھی کہ کوئی شاعر تخیلاتی فضا سے نکل کر محض انسانی تجربات یا زندگی کے چھوٹے چھوٹے دکھوں کو موضوعِ بحث بنائے۔ وہ عشق کو عینِ حیات سمجھتے تھے۔ یاسؔ کا قول تھا۔

عشق ہی عین زندگی تو نہیں
ہاں مگر زندگی کا آلۂ کار

عشق کی مدح کے بغیر شاعری کو آرٹ کے مرتبے تک پہنچانا آسان نہیں تھا لیکن یہ بات اس کے مخالفین نہیں سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے اسے بھی اپنے اوپر حملہ تصور کیا۔

ان کے کان اُن لفظوں سے آشنا تھے، جنہیں وہ برسوں سے سنتے چلے آرہے تھے اور جو غزل کے مستقل کردار تھے یعنی ناصح، واعظ، دربان، رقیب، نحیف وغیرہ یاسؔ نے ان کرداروں کا سرے سے انکار کر دیا۔

تمام پرانوں میں ایک نئے کی یہ جسارت قابلِ معافی نہیں تھی۔ یاسؔ کو اس کی سزا بھگتنی پڑی۔ اس کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

اس طوفان نے اسے بھی آمادۂ پیکار کر دیا۔ اس کی خودستائی، خود پرستی کی آخری حدوں کو چھونے لگی۔ اس کی انفرادیت پسندی نے اسے شمشیرِ بے نیام کر دیا۔ اب اسے مورچا بند ہو کر جنگ کرنی تھی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب اس نے کشتوں کے پشتے لگانے کی ٹھان لی۔

وہ اپنی دانست میں لکھنؤ کے اساتذہ کو فتح کر چکا تھا۔ انہیں اب وہ اپنے مقابلے کا سمجھتا بھی نہیں تھا۔ اس کے شعورِ برتری نے مزید پاؤں پھیلانا چاہے۔

اس نے جب یہ دیکھا کہ اس کے حریف غالب پرست ہیں اور آتشؔ پر غالب کو ترجیح دیتے ہیں تو اس نے سوچا لگے ہاتھوں غالبؔ کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔ یہ ثابت کیا جائے کہ غالبؔ بڑا شاعر تھا لیکن اتنا بڑا نہیں جتنا اس کے حریف اسے سمجھتے ہیں۔

لڑائی لکھنؤ والوں سے تھی، بیچ آ گئے بے چارے غالبؔ۔

غالبؔ کی عظمت کو اسی طرح گھٹایا جا سکتا تھا جب وہ خود کو غالبؔ کے برابر بلکہ اس سے برتر ثابت کرتا۔ خود کو نمایاں کرنے اور اپنی انفرادیت کو بچانے کے لیے اس نے غالبؔ کے تسلط کا جوا اپنے کاندھے سے اتار پھینکا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ اس کے اور غالب کے تجربات میں تو مطابقت ہے لیکن غالبؔ ان تجربات کے فنکارانہ اظہار میں اس کے برابر نہیں یا کم از کم غالبؔ اور اس کی حیثیت مساوی ہے۔

''وہ بھی استاد تم بھی اک استاد۔''

یہ خیال آتے ہی وہ غالبؔ کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ اس کا قلم حرکت میں آیا۔

کس سے کہوں کیا ہوں ارے واہ رے میں
آفت ہوں بلا ہوں ارے واہ رے میں
بھاری ہے بڑے بڑوں پہ مردہ اپنا
غالبؔ کا چچا ہوں ارے واہ رے میں

جب اس برابری پر لوگوں نے انگلیاں اٹھائیں تو وہ اور تن گیا۔ وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ کبھی کبھی ہار ماننے میں بڑائی ہوتی ہے۔ اس نے ایک مرتبہ جو رائے قائم کر لی، اس پر آگے ہی آگے بڑھتا رہا اور غالب شکن مشہور ہو گیا۔ ایک مضمون لکھا جس میں غالب کی چوریوں کو ظاہر کیا تھا۔ غالبؔ پر تنقید کی اور تنقید بھی مبتذل اور رکیک جملوں کی حد تک۔ کسی نے اگر غالب کی حمایت کی تو اس نے اسے بھی آڑے ہاتھوں لے لیا۔

غالبؔ کو میرؔ سے بڑھانے والے
چوروں کو بانس پر چڑھانے والے
اندھوں کو اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے
دنیا کو غلط سبق پڑھانے والے

اس نے صاف کہہ دیا ''میرا مذہب غالب پرستی نہیں بلکہ خود پرستی ہے حق پرستی ہے۔''

جب زیادہ لے دے ہوئی تو اس نے اپنی صفائی میں یہ بھی کہا۔

''غالب پرستوں نے تمام اساتذہ ماضی و حال کا حق تلف کر کے غالب کو دے دیا مگر میں نے ہرگز غالب کا حق تلف کر کے دوسروں کو نہیں دیا۔ ان کو اردو کا مایہ ناز شاعر مانتا ہوں۔ غالب کے کمالاتِ فن کا معترف ہوں مگر اس حد تک جتنا میرا ضمیر اجازت دیتا ہے۔ میں غالب کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، پرائی آنکھ سے نہیں۔''

''غالب پر جتنی بوچھاریں ہو رہی ہیں، انہیں غالب سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بوچھاریں تو فقط اس غرض سے ہیں کہ غلچیوں کی بہکی ہوئی ذہنیتوں پر چوٹ پڑے۔''

وہ جواز پیش کرتا رہ گیا لیکن اس کے نکیلے فقرے، تیز جملے، مضحک رباعیات اسے غالب کی توہین کا مرتکب بناتے رہے۔ اس کے مخالفین اس مخالفت کو مزید ہوا دیتے رہے اور یہ ثابت ہو گیا کہ وہ ایسا خود پرست ہے کہ غالب کو بھی خود سے کم تر سمجھتا ہے۔

جو غالب کو نہ بخشے، وہ ہم عصروں کو کیا اہمیت دیتا۔ اس نے لکھنؤ سے باہر بھی ہاتھ مارے۔ طنز، تحقیر، پھبتی تشدد، زیادتی ہر چیز سے کام لیا۔

فراق سے براہِ راست خطاب کیا۔

''شعر و شعریت پر لیکچر دینے والے تو بہت ہیں مگر آپ نے یہ بھی کہیں پڑھا ہے کہ شعر گوئی کے اصول اور اس کے گر کیا ہیں۔ آپ نے سنا تو ہو گا سفینہ کے علاوہ ایک علم سینہ بھی ہوتا ہے۔''

حسرت موہانی کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا۔

''ان کی شاعری کچھ ایسی بلند تو ہے نہیں البتہ بعض غیر شاعرانہ وجوہ کی بنا پر انہیں چمکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوئی شریف آدمی خواہ وہ کتنا ہی خوش مزاج اور بہت سے حج

وج بھی کر چکا ہو، یہ کیا ضروری ہے کہ ان خوبیوں کے پیشِ نظر وہ بڑا شاعر بھی بنا دیا جائے۔"

اصغر گونڈوی اپنی نیک نفسی کی بدولت احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے لیکن یگانہ نے انہیں ان الفاظ میں یاد کیا۔

"ایک گنوار گونڈوی کو یگانہ کا مدِ مقابل ہی نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ یگانہ پر اس شخص کو فضیلت دی گئی۔"

جوشؔ کے بارے میں۔

جوشؔ بھی اس دور کا ایک GENIUS ہے مگر بھٹکا ہوا اور فنِ شعر میں ناقص۔ کلام میں دھوم دھام تو بہت ہے مگر خلوص بہت کم۔ کہیں تو سچا کہیں بوگس۔"

جگر مراد آبادی کے بارے میں ارشاد ہوا۔

"اناڑی، موزوں طبع۔"

یہی نہیں بلکہ جگرؔ کی خبر تو اپنی رباعیوں میں بھی لی۔

جو میں نے کہا وہ بھی وہی کہنے لگا
دو باتیں سن کے تیسری کہنے لگا
میں نے کہی فارسی تو دیکھا دیکھی
کالا کوا بھی فارسی کہنے لگا

زمانہ سازی اور منافقت سے شدید نفرت اسے اس خود اعتمادی کی طرف لے گئی جو انانیت ہی کو گرہ کشا اور مشعلِ راہ سمجھنے لگتی ہے۔ اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا لیکن تعصب اور انتقامی مزاج کی وجہ سے اس میں کشادہ قلبی پیدا نہ ہو سکی۔

جب وہ یوپی کے تمام شعراء کو کھنگال چکا تو اس نے پنجاب کی طرف نگاہ کی۔ قابلِ ذکر شاعر اقبالؔ نظر آیا۔ اس کی انانیت نے پھر اسے بہکایا۔ اقبالؔ بھی میری عظمت

کے آگے کیوں ٹھہرے۔ یہ خیال آتے ہی اس کا قلم اقبال کے خلاف چل پڑا۔

"شاعر ہونا اس کے بس کی بات نہیں تھی کیوں کہ فطرت نے اسے سچا شاعرانہ شعور بخشا ہی نہیں البتہ موزونیِ طبع، مشقِ سخن اور علمی استعداد نے مل جل کر اسے شاعر نما ضرور بنا دیا اور اس کے علاوہ مذہبی اور سیاسی ضرورت نے بانس پر چڑھا دیا۔

اسٹیج کا شاعر ہے نہ چوراہے کا
لیتا ہے قلم سے کام چرواہے کا
میں بھی وہی کہتا ہوں جو تم کہتے ہو
اکبال، اکبال مگر کا ہے کا؟

یوپی سے لے کر پنجاب تک اس نے اپنے دشمن پیدا کر لیے اور چومکھی لڑنے لگا۔

ماحول اس سے صلح نہیں کر سکتا تھا، وہ ماحول سے صلح پر راضی نہ ہوا۔ نتیجہ ایک طویل معرکہ آرائی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی معرکہ آرائی سے اس کی شاعری نے تشکیل پائی، اس سے اس کی شاعری کو اور خود اسے نقصان بھی پہنچا۔ ماحول کی نامساعدت سے انفرادیت کا جذبہ، خود شناسی اور خودنگری سے بڑھ کر انانیت اور بددماغی تک پہنچ گیا۔

وہ سب کو لتاڑتا رہا اور یہ توقع کرتا رہا کہ نقادانِ فن اس کی شاعری کو سراہیں گے۔ اعتراف کریں گے کہ وہ اردو غزل کو نیا موڑ دے رہا ہے، توانائی اور تازگی سے آباد کر رہا ہے۔ وہ روایتی موضوعات اور اسالیب سے انحراف کر کے نئی غزل کا آغاز کر رہا ہے، اردو غزل کے امکانات کو وسیع کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دے رہا ہے۔

اس کی یہ خوش عقیدگی درست بھی تھی، وہ یہ کارنامے انجام دے رہا تھا لیکن نقاد اس سے خائف ہی رہے۔ اس کی پیدا کردہ ہنگامہ آرائیوں میں اس کا فن چھپا رہا۔ اس عدم مقبولیت نے اس کی بددماغی میں مزید اضافہ کر دیا۔

وہ کرائے کے مکان بدلتے بدلتے محلہ قاضی باغ کے ایک مکان کے ایک حصے

میں آ گیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی کتاب "چراغِ سخن" چھپوانے کے لیے بہت بے چین تھا۔

اس مکان کے دوسرے حصے میں پنجاب کے ایک قاضی صاحب...... نام کے ایک صاحب رہتے تھے۔ شطرنج کا شوق اسے کبھی کبھی ان کے پاس لے جاتا تھا۔ قاضی صاحب شعروادب سے تعلق تو نہیں رکھتے تھے لیکن یگانہ کے مرتبے سے واقف تھے اور ان کے دم سے جو ہنگامے زندہ تھے، وہ بھی سنتے رہتے تھے۔ اکثر اس موضوع پر باتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک دن کھیل کے دوران میں قاضی صاحب نے خود ہی تذکرہ چھیڑ دیا۔

"مرزا صاحب، ادھر جو آپ نے مضامین لکھے ہیں۔ اگر چھپ جائیں تو لطف ہی تو آ جائے۔"

"قاضی صاحب، میں تو خود اسی فکر میں ہوں کہ جتنے عزت دار بنے پھرتے ہیں، ان کا بھانڈا بیچ چوراہے پر پھوڑ دوں۔"

"پھر دیر کیا ہے، چھپوا دیں ایک کتاب۔"

"جتنی لاگت آ رہی ہے، اس میں سوسوا سو کم ہیں۔ بس یہ رقم جمع کر لوں۔ اسی فکر میں ہوں۔ رقم جمع ہوئی اور کتاب چھپی۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اتنی سی رقم کے لیے کتاب روک رہے ہیں۔"

"کیا کروں، مجبوری ہے۔"

"مجبوری کیسی۔ رقم میں دیے دیتا ہوں۔"

"نہیں قاضی صاحب، میری غیرت یہ گوارا نہیں کرے گی۔"

"غیرت کی کیا بات ہے۔ یہ رقم میں آپ کو قرض کے طور پر دوں گا۔ تھوڑے تھوڑے کر کے لوٹا دیجیے گا۔"

"وہ انکار کرتا رہا لیکن قاضی صاحب نے یہ رقم زبردستی اس کی جیب میں ڈال دی۔

کتاب تو تیار تھی۔ پیسے ملتے ہی چھپ گئی۔ (۱۹۲۲ء) اس کتاب میں اس کی وہی حشر سامانیاں بند تھیں جو اس کے نام سے پہلے شہرت پا چکی تھیں اساتذہ لکھنؤ کو ہدفِ تنقید بنایا گیا تھا۔

ابھی تک باتیں زبانی یا ادبی رسائل تک محدود تھیں لیکن جب کتاب منظرِ عام پر آئی تو باسی کڑی میں پھر سے ابال آ گیا۔

وہ کمزور نہیں تھا لیکن اکیلا تو تھا۔ اس نے اپنی جسارتوں سے سب کو اپنا دشمن بنالیا تھا لیکن وہ سمجھ رہا تھا یہ لڑائی مشاعروں تک رہے گی، میرے آگے سے دسترخوان کوئی نہیں گھسیٹے گا۔ اس کا یہ خیال اس کی بھول ثابت ہوا۔ مطبع...... نولکشور کی ملازمت اس کے بچوں کا سہارا تھی۔ سازشیوں کے کانوں بھرے ہاتھ اس کی ملازمت تک پہنچ گئے۔ ایک آدمی جس کی زبان مستند نہیں، جس کی شاعری قابلِ اعتبار نہیں، جو لکھنؤ کے اساتذہ پر تنقید کرتا ہے، اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کتابوں کی عبارتیں درست کرتا پھرے۔

اس دن وہ روز کی طرح نوکری پر پہنچا تو اسے بدلی ہوئی آنکھوں اور اُترے ہوئے چہروں کا سامنا کرنا پڑا۔

''اب ہمیں آپ کی ضرورت نہیں رہی۔''

''تو سازشی ہاتھ یہاں تک پہنچ گئے؟''

''ملازمت سے برطرفی کے لیے وجہ بتانے کی ضرورت نہیں۔''

''تم یہ سمجھتے ہو کہ اس چوٹ سے میں بلبلا اٹھوں گا؟''

''ہم کچھ نہیں سمجھتے۔''

''میری نوکری چھیننے والے میری خودداری نہیں خرید سکتے'' اس نے کہا اور گھر چلا آیا۔

کہنے کو اس نے کہہ دیا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ کلام کی داد مل بھی گئی تو اس سے

مادی زندگی کی تلخیوں کا ازالہ تو نہیں ہو سکتا۔ وہ تو پیسے ہی سے ممکن ہے اور پیسے پیدا کرنے کے لیے میں پیدا نہیں ہوا، خیر جو ہوا سو ہوا۔

جمع پونجی کتاب میں لگ چکی تھی، مقروض الگ ہو گیا تھا۔ قرض کی کچھ رقم لوٹائی تھی کہ نوکری ہاتھ سے چلی گئی۔

ضرورتیں منہ کھولے کھڑی تھیں کہ اس کے ہاتھ خالی ہو گئے۔ اس نے ان خالی ہاتھوں میں اپنے کتب خانے کی کچھ کتابیں اٹھائیں اور باہر نکل گیا۔

پرانی کتابوں کا کاروبار کرنے والوں سے اس کی شناسائی تھی۔ وہ کبھی کبھی کوئی نادر کتاب ان سے خرید لیتا تھا لیکن آج وہ کچھ کتابیں بیچنے کے لیے آیا تھا۔

''مرزا صاحب، ان کتابوں نے کیا قصور کر دیا؟'' دکان دار نے ازراہِ تفنن کہا۔

''بھئی، ان کتابوں کو ہم پڑھ چکے اور اب تو گھر میں اتنی جگہ بھی نہیں رہی کہ انہیں رکھ سکوں۔ سوچا یہاں ہوں گی تو کسی باذوق کے کام آ جائیں گی اور مجھے چار پیسے مل جائیں گے۔''

دکان دار نے پیسے آنکے۔ کچھ رد و بدل ہوا۔ اس نے پیسے مرزا کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

کچھ دن سر سے گزر گئے۔ پاؤں پھر کتب خانے کی طرف اٹھ گئے۔ ہاتھوں نے کچھ کتابیں اور اٹھا لیں۔

اس کی بیوی دیکھ تو کب سے رہی تھی لیکن سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کتابیں اٹھا کر جاتا کہاں ہے۔ سمجھی تو یہ کہ کسی دوست کو پڑھنے کے لیے دے آتے ہیں۔

''ایسی نایاب کتابیں آپ کس کو دے آتے ہیں؟'' ایک دن اس کی بیوی نے پوچھا۔

''امین آباد میں ہمارے ایک نئے دوست بنے ہیں۔ انہیں مطالعے کا بہت شوق

ہے۔ان کے لیے لے جاتا ہوں۔"

"واپس بھی تو لایا کریں۔ کتنے شوق سے آپ نے یہ کتابیں جمع کی ہیں۔ کیا سب انہیں دے دیں گے؟"

"آجائیں گی واپس" اس نے کہا اور جلدی سے گھر سے نکل گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیوی کوئی اور سوال کرے۔

اس کے جانے کے بعد اس کی بیوی کتابوں والے کمرے میں گئی۔ کتابیں تو آدھی بھی نہیں رہ گئی تھیں۔ جلد جلد مکان بدلنے میں یوں بھی بہت سی کتابیں ضائع ہو گئی تھیں لیکن اب تو نقشہ ہی دوسرا تھا۔ ایسی بھی کیا دوستی، اس نے سوچا۔ آنے دو آج، بات ضرور کروں گی۔

گھر کے وسیع و عریض آنگن میں امرود کے درخت کے نیچے ایک چارپائی پر شفاف چادر بچھی تھی اور ایک گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقے سے شغل کر رہا تھا۔ نزدیک ہی دوسری چارپائی تھی جس پر اس کی بیوی پاندان کے پاس بیٹھی سروتے سے ڈلی کاٹ رہی تھی۔ کوئی بات ہو کر چکی تھی کیونکہ دونوں بڑی دیر سے خاموش تھے بالآخر یگانہ نے مہر سکوت توڑی۔

"بات یہ ہے بیگم کہ میں یہ کتابیں کسی دوست کو نہیں، کباڑیے کو دے کر آتا ہوں۔"

"اے وہ کیوں؟"

"کتابیں بیچ بیچ کر ہی سفید پوشی کا بھرم رکھ سکتا ہوں، جب تک رکھوں۔ آپ تو جانتی ہیں میں بے روزگار ہو گیا ہوں لیکن بچوں سے کیا کہوں۔ انہیں تو دو وقت کی روٹی چاہیے ہے۔"

"اب آپ جھوٹ بھی بولنے لگے ہیں۔ آپ تو کہہ رہے تھے، دوست کے لیے

کتابیں لے جاتا ہوں۔"

"آپ کو خود ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ لکھنؤ میں ہمارا کوئی دوست رہا ہی کہاں۔"

کچھ دیر کے لیے آنگن میں پھر سکوت ہو گیا" آئندہ آپ کوئی کتاب کباڑیے کو نہیں دیں گے۔ مجھے فاقے منظور ہیں، آپ کی کتابیں بک جائیں یہ منظور نہیں۔"

"فاقے بھی کہاں تک کرو گی" یگانہ نے کہا اور حقے کی نے منہ سے لگالی۔

اس کی بیوی نے اس کی نظر بچا کر آنکھوں کے بھیگے ہوئے گوشے صاف کیے اور ڈلی کاٹنے میں مشغول ہو گئیں۔

خون کے گھونٹ بلا نوش پیے جاتے ہیں
خیر ساقی کی مناتے ہیں، جیے جاتے ہیں
ایک تو درد ملا اس پہ یہ شاہانہ مزاج
ہم غریبوں کو بھی کیا تحفے دیے جاتے ہیں
دل ہے پہلو میں کہ امید کی چنگاری ہے
اب تک اتنی ہے حرارت کہ جیے جاتے ہیں
ڈوبتا ہے نہ ٹھہرتا ہے سفینہ دل کا
دم الٹتا ہے مگر سانس لیے جاتے ہیں
کیا خبر تھی کہ یگانہ کا ارادہ یہ ہے
ڈوب کر پار اترنے کے لیے جاتے ہیں

جب وہ خود کتب خانے میں گیا تو دھک سے رہ گیا۔ اس نے ابھی تک یہ غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ کیا کچھ گنوا چکا ہے۔ جتنی کتابیں رہ گئی تھیں، وہ اتنی نایاب تھیں کہ وہ انہیں

کسی قیمت پر نہیں بیچ سکتا تھا۔

یہ دن اس پر بہت سخت آئے تھے۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ چار چھوٹے چھوٹے بچوں کی بھوک کی نقاہت سے کمھلائی ہوئی صورتیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی وفا شعار بیوی بڑی ہمت سے ان حالات کا مقابلہ کر رہی تھی۔ گھر میں آنے جانے والوں کو پتا نہ چلتا تھا کہ اس گھر میں دو دو تین تین دن، بعض اوقات چولھا جلنے کی نوبت نہیں آتی۔

حقیقت یہ تھی کہ اگر اس سے اس کی بیوی تعاون نہ کرتی تو پامردی اور استقامت سے حالات کا مقابلہ کرنا اس کے اختیار میں نہ رہتا۔ وہ اپنے مشن پر ڈٹا ہوا تھا، یہ اسی تعاون کا نتیجہ تھا۔

لکھنؤ میں اس کے سسرالی رشتے دار بہت سے تھے لیکن یگانہ کی خودداری ان سے کچھ طلب کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے تو کبھی یہ گوارا بھی نہیں کیا کہ کرائے کے مکان سے اٹھ کر سسرال میں چلا جائے۔ اس کی بیوی اس کے مزاج سے آشنا تھی اس لیے اس نے بھی اپنے میکے والوں سے کوئی مدد لینا گوارا نہیں کیا بلکہ ان پر ظاہر ہی نہیں ہونے دیا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔

وہ حصولِ معاش کے لیے مسلسل کسی ذریعے کی تلاش میں تھا لیکن اس کی ہر کوشش نقش بر آب ثابت ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے لکھنؤ میں کوئی اسے ملازمت دینے کو بھی تیار نہیں۔

وقت جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے تھے۔ معاشی بدحالی نے اسے بوکھلا دیا تھا لیکن وہ اپنے مشن سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

ان حالات میں کوئی بھی ہوتا تو اس کے قدم اکھڑ جاتے لیکن وہ پامردی سے ڈٹا رہا۔

انھی دنوں اس کی بیوی کے ایک منجھلے بھائی جو یوپی کے ایک چھوٹے سے مقام کے اسٹیشن ماسٹر تھے، لکھنؤ آئے۔ انہوں نے جو یہ حالات دیکھے تو سب کچھ سمجھ گئے۔ انہیں

یہ بھی معلوم تھا کہ یگانہ کی خودداری کسی امداد کو قبول نہیں کرے گی۔ انہوں نے سوچا کہ اپنی بہن اور بچوں کو اپنے پاس لے جائیں تو یگانہ کا بوجھ کم ہو جائے گا۔

''میں انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ ان کی طرف سے بے فکر ہو کر تلاشِ معاش کر سکیں'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے یگانہ سے کہا۔

''یہ میری راہ میں کب رکاوٹ بن رہے ہیں۔ میرے تو بچے بھی میری طرح حوصلے کی تصویر ہیں۔''

''یوں بھی، دیہات کی فضا میں کچھ دن رہ لیں گے تو بچوں کی صحت پر خوش گوار اثر پڑے گا۔''

انہوں نے جان بوجھ کر یہ نہیں کہا کہ اس طرح آپ کا معاشی بوجھ کم ہو جائے گا۔

جب اصرار بہت بڑھا تو یگانہ نے اجازت دے دی۔ بچے اور بیوی اس سے دور چلے گئے۔

وہ سب کے لیے جتنا تلخ تھا، بیوی کے لیے انتہائی نرم تھا۔ اس میں اس کے مزاج سے زیادہ بیوی کی اطاعت گزاری کا دخل تھا۔ اسے اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ بچوں کو تو وہ ایک لمحے کو خفا نہ دیکھ سکتا تھا۔ اکثر شعراء کی طرح لاابالی اور غیر ذمے دار نہیں تھا۔

بیوی بچوں کی جدائی سے وہ چند روز ہی میں پریشان ہو گیا لیکن یہ سوچ کر گوارا کر رہا تھا کہ جس گھر میں وہ گئے ہیں وہاں چولھا تو جلتا ہوگا۔

اس کی بیوی کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ وہ آ تو گئی تھی لیکن ہر وقت یہی فکر رہتی تھی کہ وہ کیا کر رہے ہوں گے۔ کھانے پینے کی تمام اشیاء بھائی کے گھر میں افراط سے بھری ہوئی تھیں۔ کام کرنے کے لیے ایک عورت آتی تھی۔ گھر میں گائے پلی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تو ٹھاٹ سے بیٹھ کر کھاتی۔ بھائی کا گھر تھا کسی غیر کا نہیں تھا لیکن دس بارہ روز ہی میں اس کا دل اکتا گیا۔

''بھیا ہمیں لکھنؤ چھوڑ آؤ۔''

''ابھی آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں'' بھائی نے کہا۔

''بچے یہاں آرام سے ہیں۔ کھا رہے ہیں، کھیل رہے ہیں۔ یہ تمہیں بُرا لگتا ہے۔''

''مجھے تو یہ سوچ کر خفقان ہوتے ہیں کہ وہ وہاں اتنے بڑے گھر میں اکیلے گھبرا رہے ہوں گے۔ میں یہاں انڈے، مرغی کھا رہی ہوں اور وہ نہ جانے کس حال میں ہوں گے۔''

''اکیلا آدمی کسی نہ کسی طرح گزارہ کر لیتا ہے۔ ان کی نوکری لگ جائے پھر چلی جانا۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ بُرے دنوں میں یہاں چلی آئی، اچھے دنوں میں پھر ان کے پاس چلی جاؤں۔ بس ہمیں ابھی چھوڑ کر آیئے۔''

اس نے اتنی ضد کی بھائی مجبور ہو گئے اور وہ یگانہ کے پاس لکھنؤ آ گئی۔

''کیوں چلی آئیں۔ یہاں تو ابھی وہی شب و روز ہیں'' یاس نے کہا۔

''بچے آپ کے بغیر کہاں رکنے والے تھے۔''

وہ جانتا تھا کہ بچوں کا محض بہانہ ہے۔ اس کی بیوی کی وفا شعاری نے اسے رہنے ہی نہیں دیا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں کہ اس کی بیوی نے بھائی کے پاس تمام آسائشوں کو ٹھکرا دیا اور اس کے پاس مصیبت بھگتنے چلی آئی۔

سوال اب یہ تھا کہ اس کی وفاؤں کا صلہ وہ اسے کس انداز میں دے۔ نوکری کا ابھی تک کوئی بندوبست نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ ہو گیا جس سے وہ ابھی تک بچتا رہا تھا۔ مکان کا کرایہ تک دینے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اسے مجبوراً سسرال میں رہنا پڑا۔ اس نے اپنی بچی کھچی کتابیں اور سامان سمیٹا سسر کے مکان میں شفٹ ہو گیا۔

یہ اس کی غیرت پر بڑی چوٹ تھی جو شاید خدا کو بھی پسند نہیں آئی۔ سسرال میں کچھ ہی دن رہا ہوگا کہ اسے لکھنؤ سے باہر ایک شہر اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت مل گئی۔

تنخواہ تو کم تھی، صرف تیس روپے لیکن گرتی ہوئی دیوار کا سایہ بھی کچھ دیر کو تو بھلا لگتا ہی ہے۔ ہیڈ ماسٹر الطاف حسین اتنے بھلے اور انسان دوست تھے کہ جس نے کسی کی مدح میں کبھی کچھ نہیں کہا ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا۔

انسان وہی انسان ہے سعید الدارین
دکھ درد پہ اوروں کے جو ہو خود بے چین
کس منہ سے کہوں کہ میں ہوں تیرا بندہ
بندہ تیرا ہے ایک الطاف حسین

الطاف حسین صاحب کی دستگیری کے طفیل اس نے اس کم تنخواہ کو بھی بہت سمجھا۔ پہلے خود اٹاوہ گیا اور پھر بیوی، بچوں کو بھی بلا لیا۔

اب وہ لکھنؤ سے دور تھا۔ یہاں جس حال میں بھی ہوتا اسے یہ خفت اٹھانی نہیں پڑتی کہ اہلِ وطن اس پر ہنسیں گے۔ اس کے حریف اس کی بدحالی کو دیکھ کر خوش ہوں گے۔

اس نے ان تیس روپوں کے سہارے کو بہت سمجھا۔ اس کی زندگی پھر اسی ڈگر پر لوٹ آئی جس سے وہ کچھ دیر کے لیے ہٹ گیا تھا۔ ادبی رسالے آتے رہے، وہ اپنے تبصروں اور ڈنک مارنے والے فقروں سے دلوں کو برماتا رہا۔ ادبی دنیا میں اس کے لاکھ دشمن سہی لیکن اس کی ادبی عظمت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی غزلیں رسائل کی زینت بن رہی تھیں۔ کچھ آمدنی ان رسائل سے ہو جاتی تھی۔ وہ قدرے مطمئن ہو کر تخلیقِ ادب میں مصروف ہو گیا۔

اس کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ فکرِ سخن کے لیے رات بھیگنے کا انتظار کرتا تھا۔ جب

گھر میں سب سو جاتے تھے تو وہ چراغِ سخن جلاتا تھا۔ اس اثناء میں کوئی اچھا شعر موزوں ہو جاتا جو اسے خود پسند آ جاتا تو اکثر ایسا بھی ہوتا کہ بیوی کو سوتے سے جگا کر سناتے۔ وہ نیند کی وجہ سے پوری توجہ سے سمجھ نہ پاتی تو کہتا، کیا ذوق ہے آپ کا۔ [illegible] ہاں اچھا ہے۔ ذرا اٹھ کر سنیں تو سہی۔ شعر موزوں ہوا ہے اس وقت یا الہام ہوا ہے۔

اٹاوہ کے قیام کے زمانے ہی میں اس نے یہ معرکۃ الآرا غزل کہی تھی اور بیوی کو جگا کر سنائی تھی۔

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گم راہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

ازل سے تیرا بندہ ہوں ترا ہر حکم آنکھوں پر
مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کرکے آخر پار اتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں، کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

ذرا پاؤں ٹک گئے تو اس نے اٹاوہ سے ایک ادبی رسالہ "صحیفہ" نکالا کیونکہ جو

باتیں وہ لکھنا چاہتا تھا دوسرے رسالے والے بعض اوقات چھاپنا نہیں چاہتے تھے۔

اس نے یہ رسالہ بڑے چاؤ سے نکال تھا لیکن ایسے کام اس کے بس کے تھے نہیں۔ یہ رسالہ چل نہیں سکا اور بالآخر بند ہو گیا۔

اب بیرونِ لکھنؤ اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا تھا لیکن لکھنؤ کے روایتی غزل گو اسے ماننے کو تیار نہیں تھے۔ وہ لکھنؤ چھوڑ کر کہیں بھی جا سکتا تھا لیکن لکھنؤ سے اسے عشق تھا۔ اس کے دل پر یہاں جتنے زخم لگے تھے، ان کا شمار نہیں تھا لیکن لکھنؤ کی محبت اس کے دل سے نکلتی نہیں تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھے کہ میرے دل میں لکھنؤ کی محبت اولاد سے بڑھ کر ہے۔

لکھنؤ کی محبت سے دل آباد سہی لیکن پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے بھی تو کچھ درکار تھا جو لکھنؤ میں رہ کر میسر آنا مشکل تھا۔ شعراء تو مشاعروں کی آمدنی سے زندگی گزار لیتے ہیں لیکن اس بد دماغ کو تو مشاعروں میں بھی کم کم ہی بلایا جاتا تھا۔ اس کے خلاف اتنے طوفان اٹھے تھے کہ مشاعروں کے منتظمین اسے بلاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ نہ معلوم اس کی موجودگی سے کون سا بڑا شاعر خفا ہو جائے۔ اسی کی طرح کوئی دیوانہ ہوتا تو یہ خطرہ مول لے سکتا تھا۔ ان دنوں لاہور میں ایسا ہی ایک دیوانہ تھا جس کا نام علامہ تاجور نجیب آبادی تھا۔ وہ انجمن اربابِ علم کے تحت ماہانہ مشاعرے منعقد کراتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں ایک مشاعرے میں انہوں نے مرزا یاس کو بھی بلایا۔ (ابھی تک وہ مرزا یاس تھا یگانہ چنگیزی نہیں بنا تھا)

لاہور کے ایس۔ پی۔ ایس کے ہال میں بڑی پُر رونق محفل تھی۔ جگر مراد آبادی اور اصغر گونڈوی بھی اس مشاعرے میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔

حفیظ جالندھری کا ایک شاگرد، دوارکا داس شعلہ بھی اس مشاعرے میں تھا۔ شاعر اچھا تھا لیکن اساتذہ میں گھر گیا تھا۔ حفیظ اس لیے داد نہیں دے رہے تھے کہ ایک ادنیٰ شاگرد کو کیا داد دیں۔ تاجور اس لیے چپ تھے کہ وہ حفیظ کا شاگرد تھا۔ حفیظ اور تاجور ایک دوسرے کے حریف تھے۔ جگر ہوش میں نہیں تھے اور اصغر بول ہی نہیں سکتے تھے کہ گلا پان کی

پیک سے بھرا ہوا تھا۔

مرزا کو اس لڑکے پر رحم آیا کہ شعر اچھے پڑھ رہا ہے لیکن داد سے محروم ہے۔ سامنے بیٹھے کالج کے طلبہ ضرور داد دے رہے ہیں لیکن ان کا اپنا انداز ہے۔ حوصلہ افزائی کے لیے بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔

ایک شعر پر مرزا سے ضبط نہ ہو سکا "واہ میاں شعلہ! کیا خوب شعر کہا ہے۔"

نوجوان نے شکر گزار آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا کہ اس شاعر سے ملنا چاہیے۔

محفل برخاست ہونے کے بعد وہ لڑکا صدر دروازے پر اس کا منتظر تھا۔ کچھ دیر میں وہ سربرآوردہ شعراء کے ہمراہ مولانا تاجور کی معیت میں باہر آیا۔ نوجوان اسے دیکھ کر اس کی طرف لپکا۔

"حضور، اگر کل تک آپ یہیں رہیں تو مجھے شرفِ نیاز کا موقع عطا فرمایئے، احسان ہوگا۔"

"کیوں بھئی، ایسی کیا بات ہے، جب جی میں آئے چلے آؤ۔ میں دو چار دن تو ابھی رکوں گا ہی" مرزا نے کہا۔

"آپ ٹھہرے ہوئے کہاں ہیں؟"

"دیکھو میاں، کل میرے دفتر آ جانا۔ ملاقات ہو جائے گی" علامہ تاجور نے کہا اور مرزا کو لے کر آگے بڑھ گئے۔

دوارکا داس شعلہ وقت کا تعین کرنا تو بھول ہی گیا تھا کہ مولانا تاجور کے دفتر جائے لیکن کس وقت۔ پھر بھی وہ دوسرے دن دس بجے مولانا کے دفتر پہنچ گیا۔ وہاں نہ مولانا تھے نہ مرزا یاس۔ چنگڑ محلے ہی میں یاس ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ دفتر سے اس کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ مرزا نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ دیر تک اس سے باتیں بھی کیں اور رات کے

کھانے پر مدعو بھی کیا۔

شعلہ کے لیے اس کا یہ اخلاق حیران کن تھا۔ وہ تو اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سن چکا تھا۔ اس کی بد دماغی کے بارے میں کئی قصے اس تک پہنچے تھے۔ وہ اس میں اتنا غرور بھی نہیں دیکھ رہا تھا جتنا عام ادیبوں میں دیکھ چکا تھا۔

یاسؔ تو مشاعرے میں شرکت کرنے آیا تھا، واپس چلا گیا لیکن شعلہ کے دل پر گہرا اثر چھوڑ گیا۔

اسی سال حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ اسے مستقل قیام کے لیے لاہور آنا پڑا۔ تاجورؔ نجیب آبادی نے اردو مرکز کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کی عبارت کی درستی کے لیے تاجورؔ نجیب آبادی نے اس کا اور جگر کا نام منتخب کیا تھا۔

یہ ایسی باعزت ملازمت تھی جسے وہ ٹھکرا ہی نہیں سکتا تھا۔ خاص طور پر ایسے عالم میں کہ وہ بے روزگاری کے دن جھیل رہا تھا۔ اس نے اس ملازمت کو اپنی قدر افزائی سمجھا اور لاہور روانہ ہو گیا۔ چنگڑ محلے کا جو مکان اسے ملا اس کی دو منزلیں تھیں۔ اوپر کی منزل میں وہ تھا، نچلی منزل جگر کو دی گئی تھی۔ جگر اور اس کا کوئی میل ہی نہیں تھا۔ جگر ان دنوں مے پرستی کے دن گزار رہے تھے جبکہ یاسؔ اس شغلِ مے نوشی سے بہت دور۔ قریب رہنے کی وجہ سے جگر اور مرزا یاسؔ کا ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا ہو گیا۔ بہت سی غلط فہمیاں رفع ہوئیں۔

یاسؔ اکیلا آیا تھا لیکن بعد میں اس نے بچوں کو بھی بلا لیا۔ دوارکا داس شعلہ اس کا عقیدت مند تھا۔ لاہور میں مرزا کے قیام کی وجہ سے وہ ہمہ وقت مرزا کے ساتھ رہنے لگا۔

شعلہ ہی کی تحریک پر اس نے اپنا مجموعۂ کلام، آیاتِ وجدانی مرتب کرنا شروع کیا۔ ایک پبلشر سے پانچ سو روپے میں معاملہ طے ہوا۔ پبلشر نے سو روپے دے کر مسودہ حاصل کر لیا اور باقی رقم آئندہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ چند ماہ میں کتاب شائع بھی ہو گئی

لیکن مرزا کو چار سو روپے نہ مل سکے۔

"اگر مجھے کسی طرح میری چار سو روپے مل جائیں تو میرے کئی رکے ہوئے کام نکل سکتے ہیں" اس نے شعلہ سے کہا۔

"آپ ان پبلشروں کو نہیں جانتے۔ چار سو روپے کے آدھے بھی مل جائیں تو بہت ہوں گے۔ بہر حال میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

شعلہ نے پبلشر سے بات کی اور وہ مرزا سے ملنے آ گیا۔ اپنی مجبوریوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ مرزا کو رحم آ گیا۔ اس نے صرف سو روپے اس کے آگے رکھے اور اس نے قبول کر لیے۔

پبلشر نے شعلہ سے کہا کہ وہ حساب بے باق کر آیا لیکن مرزا سے معلوم ہوا کہ صرف سو روپے ادا کیے ہیں۔

"یہ آپ نے کیا، کیا؟ سو روپے لے کر معاملہ کیوں طے کر لیا؟" شعلہ نے پوچھا۔

"یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ کسی کی کھال تک کھینچ لی جائے۔"

"یہ لوگ بڑے چالباز ہیں۔ آپ خواہ مخواہ اس کی باتوں میں آ گئے۔"

"جناب، آپ نے اسے دیکھا ہوتا تو پتا چلتا۔ وہ بے حد مجبور تھا۔ بے چارے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ تو میں نے اسے دلاسا دے دیا ورنہ رو پڑنے میں کون سی کسر رہ گئی تھی۔"

"آپ کی تلخ بیانی کے ویسے تو بہت سے قصے مشہور ہیں لیکن آپ ایک پبلشر سے دب گئے۔"

"میری لڑائی صرف ادب تک ہے، ذاتی نہیں۔ وہ کوئی غلط شعر کہہ کر دیکھے، پھر دیکھو میں اس کا کیا حلیہ بناتا ہوں۔"

''بھائی، پیسوں کی لڑائی ہمیں نہیں آتی'' اس نے کہا اور گویا معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

مرزا کا یہ روپ سب ہی کے لیے حیران کن تھا۔ جس کی بد دماغی افسانوی حیثیت اختیار کرگئی تھی، وہ اندر سے اتنا نرم ہوسکتا ہے۔

لاہور کا قیام اس کی زندگی کے لیے تاریخی بن گیا تھا۔ لاہور کی ادبی فضا اور جاں نثار دوستوں کی قربت نے دوسال کی مدت پل بھر میں گزار دی۔

لکھنؤ سے خط آیا کہ اس کے سسر کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اس نے بچوں کو لکھنؤ بھیج دیا۔

اردو مرکز کا وہی حشر ہوا جو اس قسم کے ادبی اداروں کا ہوتا ہے۔ ملازمت جاتی رہی اور اس نے چند دوستوں کی جدائی کا داغ دل پر لے کر لاہور چھوڑ دیا۔

وہ سسر کے انتقال سے ایک دن پہلے لکھنؤ پہنچ گیا۔ سسر کی تدفین سے نمٹنے کے بعد جب اس نے اپنی حالت پر غور کیا تو وہ ایک مرتبہ پھر صحرا میں اکیلا کھڑا تھا۔ اسے پھر کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ دور دور تک پانی کا کوئی چشمہ نہیں تھا اور وہ سخت پیاسا تھا۔ پھر اس نے تلاشِ معاش کے لیے دکن جانے کا ارادہ کیا۔ حیدرآباد دکن ایک بڑی مسلم ریاست تھی۔ وہاں شعراء کی قدردانی بھی تھی اور ملازمتوں کی کثرت بھی۔ کچھ لوگوں سے اس سلسلے میں خط و کتابت بھی ہوئی تھی لہٰذا اسے امید تھی کہ اگر وہ وہاں پہنچ گیا تو کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔

جیسے تیسے اس نے زادِ سفر مہیا کیا، گھر میں خورونوش کا کچھ سامان ڈالا اور بچوں کو اللہ کے توکل پر چھوڑ کر عازمِ دکن ہوگیا۔

یوپی بھر میں دھوم مچانے کے بعد جب وہ دکن پہنچا تو اس کی توقع سے زیادہ اس کی پذیرائی ہوئی۔ گہما گہمی، خاطر تواضع اور آؤ بھگت میں آٹھ دس روز گزر گئے۔ اسے اتنی فرصت ہی نہیں مل رہی تھی کہ وہ بیٹھ کر کسی ملازمت کے لیے سوچتا۔

اس کے اعزاز میں دعوت تھی جس میں معززین شہر مدعو تھے۔ انواع واقسام کی نعمتیں دسترخوان پر سجائی جارہی تھیں۔ ان نعمتوں کو دیکھ کر اسے بچے یاد آگئے۔ اس نے سوچا، میں تو یہاں یہ نعمتیں کھا رہا ہوں، وہاں میرے بچوں پر نہ جانے کیا عالم گزر رہا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی اس کا دل اچاٹ ہوگیا۔ میں یہاں دعوتیں کھانے تو نہیں آیا تھا۔

کچھ دیر وہ وہاں کے انتظامات دیکھتا رہا اور پھر لوگوں کی نظریں بچا کر وہاں سے نکل آیا۔ لوگوں نے اس کی اس حرکت کو اس کی بددماغی سے تعبیر کیا ہوگا۔ یہ کوئی نہیں سوچ سکتا ہوگا کہ عام شعراء کے برعکس اس کا عشق اس کے گھر تک محدود ہے۔ وہ یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ اس کے بچے فاقے کریں اور وہ دعوتوں سے لطف اندوز ہو۔

لوگ اسے تلاش کرتے رہ گئے اور وہ اپنی قیام گاہ پر آکر کمرے میں بند ہوگیا۔

کچھ دیر بے چینی سے ٹہلتا رہا پھر اپنی بیٹی بلند اقبال کے نام خط لکھنے بیٹھ گیا۔

''میری بچی! تیرا بابا کیسی مجبوری میں تم لوگوں کو اس حال میں چھوڑ کر نکلا ہے اور حال یہ ہے کہ دل کو قرار نہیں۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ دعا کرو کہ آزمائش کے یہ دن جلد ختم ہوں۔''

جن نواب صاحب کے پاس وہ مہمان ٹھہرا تھا، انہیں اس کیفیت کا علم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ ان کی برہمی بے جا نہیں تھی۔ مرزا کا موقف بھی بے جان نہیں تھا۔

''میں یہاں دعوتیں کھانے نہیں آیا۔ میری ملازمت کا بندوبست ہوتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میں لکھنؤ واپس چلا جاؤں گا۔''

''کیوں دل تھوڑا کرتے ہیں۔ میں آپ کو حضور نظام سے ملوانے کا بندوبست کررہا ہوں۔''

وہ خوش ہوگیا کہ اب تنگی کے دن ختم ہوجائیں گے۔ دربار کی شاہانہ مراعات سے تو اس کا دامن تنگ پڑ جائے گا۔ اس نے تصور ہی تصور میں اپنے بچوں کی شاندار زندگی کا

خواب دیکھ لیا۔

نواب صاحب ایک دن واقعی یہ خوش خبری لے کر آ گئے کہ نظام سے اس کی ملاقات کا انتظام ہو گیا ہے۔

''سرکار آپ کو ضرور پسند فرمائیں گے کیونکہ آپ کا کلام ہی جاندار ہے۔''

''تو پھر دیر کیا ہے۔ چلتے ہیں، آپ کے سرکار سے بھی مل آئیں'' اس نے اس طرح کہا جیسے نواب صاحب کے کسی دوست سے ملنے جا رہا ہو۔

''مرزا صاحب، آپ واقعی بہت بھولے ہیں۔ وہاں جانے کے لیے بہت کچھ اہتمام کرنا پڑے گا۔''

''بھئی اگر یہ شیروانی ٹھیک نہیں ہے تو ہم دوسری پہنے لیتے ہیں اور پھر حضور نظام کو ہمارے کپڑوں سے نہیں، ہماری شاعری سے غرض ہوگی۔''

''حضوری میں جاتے وقت آپ کو شاہی آداب کے مطابق شیروانی پر پیٹی کسنا اور دستار پہننی پڑے گی۔''

''اور کیا کرنا ہوگا؟''

''روبرو پہنچ کر کمر سے جھک کر تسلیمات عرض کرنا پڑے گی، لمبے ہاتھ ہلا کر۔ دستار وغیرہ کا انتظام میں کر دوں گا، اس کی آپ فکر نہ کریں۔''

''بس، بس نواب صاحب!'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے نواب صاحب کو روک دیا'' آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں اپنے میں اتنی طاقت نہیں پاتا کہ نظام کی صحبت میں جگہ پانے کے لیے ان کے اہل کاروں کی طرح بگلوس دستار لگا کر تسلیمات بجالاؤں۔ میں ایسے منصب پر لعنت بھیجتا ہوں جس سے میرا جذبۂ خودداری مجروح ہوتا ہے۔ مجھے تو حیدر آباد شہر سے بھی دور کسی جگہ چھوٹی موٹی ملازمت مل جائے تو اسی کو اپنے لیے غنیمت سمجھوں گا۔''

''کمال ہے، آپ اتنے بڑے اعزاز کو ٹھکرا رہے ہیں'' نواب صاحب نے کہا ''نظام تک پہنچنے کے لیے تو لوگ نہ معلوم کیسے کیسے جتن کرتے ہیں اور آپ ہیں کہ......''

''نواب صاحب، میں چند روزہ عیش کے لیے اپنے زندگی بھر کے اصول نہیں توڑ سکتا۔''

اس نے دنیاداری کے اعتبار سے اپنا ایک اور نقصان کرلیا۔

چند مہینوں کی صبر آزما بے کاری کے بعد اسے حیدر آباد سے دور ایک چھوٹے سے مقام لاتور میں چالیس روپے ماہوار کی نوکری مل گئی۔ آنسو خشک ہو گئے لیکن آنکھیں بھری رہیں۔ بیوی بچے لکھنؤ میں تھے اور وہ خود دکن میں۔ دو دو گھر چلانے کے لیے یہ رقم ناکافی تھی لہٰذا وہ پریشان ہی رہا اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ پریشانی ختم بھی ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے محکمے میں رشوت کی بہت گنجائش تھی لیکن وہ اس مزاج کا آدمی ہی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے اصولوں کی حفاظت کے لیے نظام سے ملاقات کو ٹھکرانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ وہ تو کسی سے تحفہ تک قبول کرنے کا روادار نہیں تھا، کجا رشوت۔

ایک صاحب اس کے لیے حقے کی تمباکو لے کر آئے۔ باتوں باتوں میں وہ قیمت پوچھنا بھول گیا اور وہ صاحب چلے گئے۔ وہ صاحب چند روز بعد پھر اس کے پاس آئے۔

''جناب، تمباکو کی قیمت تو میں نے آپ سے پوچھی ہی نہیں۔''

''قیمت کیا، یہ تو آپ کے لیے نذرانہ تھی۔''

''بھئی، کس خوشی میں۔''

''آپ نے اتنی مرتبہ مہربانی فرمائی۔ میں نے معمولی سی خدمت کردی تو کیا ہوا'' اس شخص نے کوئی دفتری واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

مرزا نے بھری چلم انڈیل دی ''لعنت ہو مجھ پر۔ میں اتنے دن تک حرام کی تمباکو پیتا رہا۔''

''حضور، میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ میری حرکت گراں گزری ہے تو آپ قیمت ادا کر دیجیے۔''

مرزا نے قیمت ادا کی اور اس شخص کو فوراً اپنے پاس سے بھگا دیا۔

آمدنی کم اور خرچ زیادہ۔ پریشانیاں بڑھتی ہی چلی گئیں۔ زندگی مسافرت میں کٹ رہی تھی۔ اسے بچوں سے ملنے بار بار لکھنؤ آنا پڑتا تھا۔ لکھنؤ سے اتنی دوری بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

اے لکھنؤ اے دیار دور افتادہ
اے جانِ من اے بہار دور افتادہ
اب دور سے اس خاک کو سجدہ کر لے
میں کون ہوں اک مزار دور افتادہ

مسافرت کی اس زندگی نے صرف اسی کو پراگندۂ خاطر نہیں رکھا بلکہ اس کے بچوں کی تعلیم پر بھی اثر پڑا جس کا اسے بہت افسوس ہوتا تھا۔ اسے یہ بھی افسوس تھا کہ اس نے اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کیا بلکہ جو کچھ ورثے میں اسے ملا تھا، اس نے وہ بھی نہیں رکھا۔ پھر خود ہی ہنس کر کہتا کہ اچھا ہوا میں نے فساد کی کوئی چیز اپنے بچوں کے درمیان نہیں چھوڑی۔ اب یہ خود ہی اپنی صلاحیتوں سے جو کرنا چاہیں گے کریں گے۔

یہ سب کہنے کی باتیں تھیں۔ وہ ایسا قناعت پسند نہیں تھا کہ اسے پرواہی نہ ہوتی۔ اسے شدت سے پروا ہوتی تھی۔ دنیاوی آسائشوں کی شدت سے خواہش تھی لیکن ان آسائشوں کے حصول میں اس کا مزاج آڑے آجاتا تھا۔ اسی لیے وہ ہمیشہ تلخ بنا رہا۔ بے نیاز آدمی تو بہت میٹھا ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ حالتِ جنگ میں رہا۔ اسی لیے کہ اس کی خواہشات پوری نہ ہو سکیں۔ وہ الجھتا رہا، کبھی خود سے کبھی دوسروں سے۔ اس الجھنے میں اسے تکلیف نہیں ہوتی تھی بلکہ اسے تسکین حاصل ہوتی تھی۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے اس

کی حق تلفی کی، اس نے ان سے خوب انتقام لیا۔ وہ متضاد کیفیات کا حامل آدمی تھا۔ ایک طرف وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اسے کچھ نہیں چاہیے، دوسری طرف اس کے حصول کے لیے جنگ کرتا تھا۔ اگر وہ قناعت پسند ہوتا تو جنگ کی نوبت نہ آتی۔ قناعت کے لیے جس سپردگی اور تسلیم ورضا کی ضرورت ہوتی ہے، اسے اس سے بیر تھا۔ وہ تو سراپا حرکت وپیکار تھا۔

گوشہ گیری ہے اک انوکھا سوانگ
مانگنا ہے کھلے خزانے مانگ

یہی اس کا تضاد تھا۔ کھلے خزانے مانگنے کا مشورہ دے سکتا تھا، مانگ نہیں سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں دل چاہتا تھا، حوصلہ کہاں سے لاتا۔ یہی تضاد اس کی بددماغی میں روز بہ روز اضافہ کرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی جنگ کے لیے نئے نئے میدان ڈھونڈتا رہا۔ غالبؔ سے صلح کا خیال بھی آیا تو اس شرط کے ساتھ۔

صلح کرلو یگانہ غالبؔ سے
تم بھی استاد وہ بھی اک استاد

برابری کا نشہ نہ اترنا تھا، نہ اترا۔ اس نے معاملے کو رفع دفع کیا بھی تو یہ کہہ کر۔

غالبؔ اور میرزا یگانہؔ کا
آج کیا فیصلہ کرے کوئی

گویا آنے والا وقت اسے غالبؔ سے بڑا شاعر ثابت کردے گا۔

دکن کی پریشانیوں نے اسے مزید الجھنوں میں ڈال دیا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف نگاہ ڈالی اور یاس سے یگانہؔ چنگیزی بن گیا۔ یگانہؔ (یکتا) بننے کی خواہش برسوں سے پرتول رہی تھی۔ چنگیزی مزاج ازل سے ودیعت ہوا تھا، صرف اعلان کرنے کی دیر تھی۔

لاتور میں پانچ سال گزارنے کے بعد وہ عثمان آباد (دکن) چلا گیا۔ یہاں وہ

سب رجسٹرار تھا اور تنخواہ پچھتر روپے ہوگئی تھی۔

اب ذرا قدم جمے تو اس نے بچوں کو بھی بلا لیا۔ ان کی تعلیم کے لیے اس نے گھر پر ہی اہتمام کیا تا کہ اردو اور فارسی کی استعداد بڑھے۔ میر انیسؔ کے مرثیے تحت اللفظ پڑھوا کر سنتا تھا۔ زیر، زبر نہ ساقط ہو، وزن نہ گرنے پائے۔

لیل ونہار اسی انداز میں گزر رہے تھے کہ اس کا بیٹا، آغا جان بیمار پڑ گیا۔ بیماری نے اتنا طول کھینچا کہ وہ فکر مند ہو گیا۔ اس کا دکن میں رہنا ضروری تھا اور آغا جان کو دکن کی آب وہوا راس نہیں آ رہی تھی۔ وہ اسے علاج کے لیے دہلی لے جانا چاہتا تھا لیکن پھر نجم آفندی کے اصرار پر بچوں کو ان کے پاس آگرہ بھیج دیا۔

یگانہؔ سے دوستی رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ کتنوں ہی نے راستے میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دوار کا داس شعلہؔ اور نجم آفندی نے مرتے دم تک دوستی کے اس رشتے کا پاس رکھا۔ نجم آفندی تو اسے بھائی کہتے تھے اور بھائی بن کر دکھا بھی دیا۔ اس کے بچوں کا ایسا خیال رکھا جیسا ایک شفیق چچا رکھ سکتا ہے۔

اس کی خودداری کے لیے یہ کتنا تکلیف دہ ہوگا کہ اس کا بچہ بیمار ہے، اس کا دوست اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے اور وہ نوکری کی مجبوری کی وجہ سے ان سے دور رہنے پر مجبور ہے۔ یہ اس کی شکست تھی اور وہ شکست ماننے کا عادی نہیں تھا۔ وہ نوکری نہیں چھوڑ سکا لیکن اس نے اپنا غصہ اپنے اندر اتار لیا۔ اسے یقین آ گیا کہ سارا کھیل طاقت کا ہے۔ انسان قدم قدم پر طاقت کے سامنے شکست کھا جاتا ہے۔ طاقت ہی سب کچھ ہے۔ یہ منفی رویہ اس کے مزاج میں پرورش پاتا رہا جس کا اظہار اس کی شاعری میں جا بہ جا ہوتا رہا۔

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ ملازمت پیشہ لوگوں کی تنخواہیں تو وہی رہیں مگر گرانی کے باعث اخراجات بڑھ گئے۔ یگانہؔ اس معاشی دائرے سے باہر نہیں تھا۔

پچھتر روپے کی تنخواہ اچانک کم پڑ گئی۔ وہ اپنے دوستوں کی جو خطوط تحریر کر رہا تھا ان میں اپنی تنگ دستی کی کڑوی باتیں کثرت سے لکھ رہا تھا۔ دوست اس کی مدد کرنا چاہتے بھی تھے لیکن اس کے مزاج سے ڈرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بے احتیاطی سے برسوں کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔

ان کے اردگرد کی غزل اب بھی حسن پرستی، عشق دوستی، غم شناسی، خود رفتگی اور کائنات فہمی کے نام پر زم گوئی اور کوش گفتاری کا ایک مقبولِ عام لہجہ پیدا کرنے میں مصروف تھی۔ یگانہ نے اپنے غصے کو فنی شکل دے کر بڑی پامردی کے ساتھ رومانیت اور جذباتیت کے اس سیلاب کو روک دیا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ اپنی کھردری باتوں اور حسن و عشق کے چٹخارے کے بغیر اس کی غزلیں مقبول ہو رہی تھیں۔

اس کی شاعری میں نہ جذباتی اندازِ بیان تھا، نہ حسن و عشق کے وہ روابط جو عام طور پر بیان کئے جا رہے تھے۔ وہ تو آدمی کی فتح و شکست، اس کی بلند نظری اور کم نظری کی سُست روی اور تیز روی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے اور ان پر تنقید کرنے میں منہمک تھا۔ وہ تو حسن کو بھی عاشق کی نظر سے نہیں ناقد کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

حسن کافر گناہ کا پیاسا
بے گناہوں کو ساننے والا

مارا فریب حسن کا پہنچے تو جانئے
کتنے خدا رسیدہ پڑے اس وبال میں
بقدرِ حوصلہ ملتی ہے دادِ عشق و ہوس
نگاہِ حسن میں کیا اعتدال ہوتا ہے

اردو شاعری کے نگار خانے میں "حسن" کی جتنی تصویریں آویزاں تھیں، یگانہ نے ان سے مختلف تصاویر بنائیں اور اس دعوے کے ساتھ کہ اصل پہلو یہ ہے۔ صرف حسن و

عشق پر ہی منحصر نہیں، اس نے برسوں کے بنے بنائے سماجی عقائد اور روز مرہ کے قدیم تصورات پر ایسی سخت چوٹیں کیں کہ لوگ بلبلا اٹھے۔ اس کے اسلوب کو پسند کیا گیا لیکن اس کے تصورات کی مخالفت کی جاتی رہی۔ اس کی جتنی مخالفت کی گئی، اس کی ضد نے اسے راہ میں اتنا ہی آگے بڑھایا۔

۱۹۴۲ء میں حالات اور بگڑے۔ تمام ضرورت کی اشیاء کی قیمتیں تین گنا ہو گئیں۔

دوارکا داس شعلہؔ اس سے ملنے آیا ہوا تھا۔ اس کی جو حالت دیکھ کر گیا تھا، اس کے بعد اس نے احتیاط کا دامن چھوڑ دیا۔ پچاس روپے بذریعہ منی آرڈر اسے بھجوا دیے۔ ہفتے بھر بعد یہ منی آرڈر واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ یگانہ کا یہ خط بھی تھا۔

''تمہارا منی آرڈر آیا تھا۔ میں واپس کر رہا ہوں کہ تم نے مدعا سے مطلع نہیں کیا۔ بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تمہیں یہاں سے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ جس کی قیمت تمہارے اندازے کے مطابق پچاس روپے ہے اور میرے حالات کے پیشِ نظر تم نے یہ رقم پیشگی بھجوا دی مگر تم نے یہ کیونکر سمجھ لیا میں سو، پچاس بھی اپنے پاس نہیں رکھتا۔ بہ فرضِ محال ایسا نہ بھی ہو تو آخر سب رجسٹرار ہوں۔ سو دو سو کا اعتبار تو دکان دار کر ہی لیتے ہیں۔ اب تم یہ کرو کہ جو چیزیں درکار ہوں ان کی فہرست بھجوا دو۔ میں خرید کر بھجوا دوں گا۔''

اس خط کے جواب میں شعلہؔ نے مدعا لکھ دیا کہ مقصد کسی چیز کی خریداری نہیں تھا۔ یہ رقم آپ کی نذر کرنا مقصود تھی۔

یگانہؔ نے ذرا سخت لہجے میں کہا ''اس کوتاہ اندیشی کی ضرورت نہیں تھی۔ بہر کیف بسر ہو رہی ہے اور ان دنوں سے بہتر جب آمدنی کی صورت یہ بھی نہ تھی۔ تم ناحق فکر مند ہوتے ہو۔''

شعلہؔ نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر یہ رقم بیگم یگانہؔ کو بھیج دی۔ انہوں نے

وصول کرلی اور یگانہ کو مطلع کر دیا۔

اب یگانہ بھتیجے سے اکھڑ گیا۔

"تم بار بار میرے صبر کو کیوں آزماتے ہو۔ میں نے پہلی مرتبہ ٹال دیا کہ مجھے تم سے بڑھ کر اور کوئی عزیز نہ تھا مگر اس قسم کی حرکتیں برداشت کرنے کا میں ظرف نہیں رکھتا۔ تم فوراً پیسے واپس منگواؤ ورنہ تم سے تعلقات ٹوٹ جانے کا صدمہ مجھے برداشت کرنا پڑے گا اور مت بھولو کہ یہ صدمہ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہوگا۔"

اس مرتبہ شعلہ نے بڑا جذباتی رویہ اختیار کیا۔ اس نے صاف لکھ دیا کہ میں نے یہ رقم اپنی ماں کو بھیجی ہے۔ آپ ماں اور بیٹے کے درمیان بولنے والے کون ہوتے ہیں۔

اس کے بعد مرزا کو چپ ہونا پڑا۔ شعلہ کو حوصلہ ہو گیا اور وہ گاہے گاہے بیگم یگانہ کی مدد کرتا رہا لیکن یگانہ نے ہمیشہ اس اپنی خودداری پر چوٹ سمجھا۔

ان معاشی اور ذاتی بکھیڑوں سے قطع نظر اس وقت پوری دنیا خاص طور پر ہندوستان نہایت، نازک دور سے گزر رہا تھا۔ تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، سیاسی ہنگامے، آزادی کے نعرے لیکن اس کا کلام ان تمام تحریکات سے منہ پھیرے کھڑا تھا۔ اس ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نہ عملی سیاست کا قائل تھا نہ نظری سیاست کا۔ اس عدم دلچسپی کے پیچھے اس کا شعورِ برتری تھا۔ وہ اپنے سوا کسی کو کوئی اہمیت دیتا ہی نہیں تھا۔ پھر کسی پر کچھ بھی گزرے، اسے کیا۔ وہ شدید قسم کی داخلیت کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ آدمی کو صرف اپنے کس بل پر ابھرتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔

تُو آپ اپنی ہے شمشیر، آپ اپنی سپر
یگانہ باگ اٹھا، اپنے بل پہ کستا جا

اس ترقی کی راہ میں اگر کوئی چیز اسے کھٹکتی تھی تو وہ تھا جبر مشیت۔ اسی جبر مشیت سے ایک مسلسل پیکار اس کی شاعری کا موضوع تھا۔ ظاہری بات تھی کہ یہ تصور شخصِ واحد کی

قوت آزمائی سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس انداز فکر کا آدمی داخلی انفرادیت اور انانیت کے سہارے ہی آگے بڑھ سکتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر سیاسی اور سماجی نظام سے دور رہا۔ اگر کبھی ذکر کیا بھی تو ہم آہنگی نہیں اختلاف کا۔ اس نے غصے سے بپھرے ہوئے آدمی کی طرح ہر نظام پر گہری چوٹ کی۔

ایسی افتادِ طبع کا آدمی جو سیاسی تحریکات سے بدظن ہو، عوام کو اہمیت نہ دیتا ہو، زمانے سے نبرد آزمائی کی صورت میں اپنی ذات پر ہی بھروسا کر سکتا ہے۔ اجتماعی قوت کے بجائے اپنی قوت کو فیصلہ کن سمجھ سکتا ہے۔

جس کی تلوار کا ہو لوہا تیز
جیت ناتمام کیا کرتا

اور یہ سب جانتے ہیں کہ ایک آدمی سب کا مقابلہ نہیں کر سکتا چاہے اس کی تلوار کا لوہا کتنا ہی تیز ہو۔ اسے بار بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ یگانہ بھی بار بار زخمی ہوتا تھا لیکن زخم مندمل ہوتے ہی پھر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

بات جب تک زندگی کی کشمکش تک رہی، اس کا اندازِ نظر تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ گوارا ہوتا رہا۔ وہ ادبی دنیا میں اکیلا رہ گیا لیکن اس کی شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی باتوں سے انکار ہو سکتا تھا لیکن اس کا کلام عالی ہمت آدمی کی شاعری کے طور پر قابلِ قبول تھا۔ اس کا اسلوب روایتی شاعری سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا کلاسیکی انداز اسے تمام معاصرین میں ممتاز کرتا تھا۔

یہاں تک تو بات نبھ ہی رہی تھی لیکن وہ جبرِ مشیت سے لڑتا ہوا خدا تک پہنچ گیا۔ خدا سے اس کا براہِ راست خطاب، شوخ انداز، طنزیہ لہجہ، کارخانۂ دنیا سے اس کا لاتعلقی بلکہ اس کی کم اثری کے بیان نے ذہنوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

ہو رہے گا سجدہ بھی جب کسی کی یاد آئی
یاد جانے کب آئے زندہ داریٔ شب کیا
ایسے ہنگامہ زارِ ہستی میں
ایک اللہ کا نام کیا کرتا

داورِ حشر کچھ نہ پوچھ عہدِ شباب کا مزہ
شہدِ بہشت تھا مگر دستِ بخیل نے گرا دیا

وہ حق پرستی کا قائل تھا لیکن حق اس کے نزدیک صرف وہ تھا جسے وہ حق سمجھتا تھا۔ اس نے دوسروں کی پروا کبھی نہیں کی۔ عوامی عقائد پر جتنی بے خوفی اور بے باکی سے اس نے اظہار خیال کیا اردو شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔

انسان اور خدا کا جائزہ لیتے ہوئے نیکی اور بدی بھی راستے میں آئی۔ نیکی تو خیر نیکی لیکن اس نے بدی کو بھی ایک قوت سمجھ لیا۔ سمجھ لیا تھا تو سمجھ لیا تھا، اس نے دوسروں کو سمجھانے کی بھی کوشش کی۔ نیکی اور بدی کے اس تصور میں اس کا تعلق مذہب واخلاق سے تھا۔

ترسی ہوئی نگاہ پہ اب رحم کیجئے
کب تک یہ امتیاز حرام و حلال میں

پچھلا پہر ہے کاتبِ اعمال ہوشیار
آمادۂ گناہ کوئی جاگتا نہ ہو

یگانہ کی فکر اب ایسی ٹیڑھی راہ پر چل نکلی تھی کہ رہے سہے دوستوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ صاف نظر آتا تھا کہ انجام برا ہوگا لیکن وہ اجتماع دشمن ہر اس چیز کے خلاف تھا جس پر سب متفق ہوں۔ اگر وہ ذرا بھی محتاط اور زمانہ ساز ہوتا تو اس راہ سے بہ آسانی گزر

جاتا لیکن اس کا کہنا تو یہ تھا کہ جو کام کرو تہِ دل سے کرو، تھوڑ دلے پن سے نہ کرو۔ وہ گناہ ہی سہی اس کے اس اندازِ فکر نے اس کی زبان سے وہ کچھ کہلوانا شروع کر دیا جو اس جیسے بلند نظر آدمی کو بسا اوقات زیب نہیں دیتا۔ وہ تو اس بات کا قائل تھا کہ جو بات کہو کھل کر کہو، چاہے کسی کی دل آزاری ہو یا فتنہ بپا ہو۔

اس نے اس موقع پر بھی کسی کی پروا نہیں کی۔ اخلاقی اور مذہبی اصولوں کی کھل کر اپنی فکر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس مرحلے پر وہ یہ بھول گیا کہ یہ اصول وہ نہیں ہوتے جسے ایک آدمی بنا دے یا مٹا دے۔

اس نے مذہب کا مطالعہ بھی کیا تو اپنی آنکھ سے۔ کچے پکے مطالعے کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذاہب نے نوعِ انسانی کو تقسیم کر دیا ہے۔ انسانوں کو ایک دوسرے سے برگشتہ کر دیا ہے، رسمیات میں پھنسا دیا ہے، آزاد خیالی چھین لی ہے۔ فنونِ لطیفہ کا خون کر دیا ہے۔

بانسری نے دلوں کو موہ لیا
کون سنتا ہے بےگانہ بانگ

ان نتائج کے بعد یگانہ اور مذہب میں ٹکر لازمی تھی اور وہ بڑے شوق سے ٹکرا گیا۔

۱۹۳۵ء میں وہ مستقل قیام کے ارادے سے لکھنؤ آ گیا۔ گویا ایک نئے معرکے کی تیاری تھی اور میدانِ جنگ میں آ گیا تھا۔

آیاتِ وجدانی کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری مکمل تھی بلکہ دکن میں جب وہ تھا تو پبلشر کی تلاش شروع کر دی تھی۔ اپنے دوست شعلہ کو بھی اس نے کئی خطوط لکھے تھے۔ بالآخر معاملات طے ہوئے آیاتِ وجدانی (جدید) منظرِ عام پر آ گئی۔

یہ ایڈیشن اس کے مذہبی نتائج کا نچوڑ تھا۔ اس کا انتساب جلالت مآب چنگیز خان کے نام تھا۔ دنیائے ادب میں شاید یہ پہلی کتاب ہو گی جو کسی نے چنگیز خان کے نام کی تھی۔

چنگیز خان کی ادبی خدمات تو ظاہر ہے کچھ نہیں۔ ہاں طاقت اور خوں خواری کے لیے اس کی شہرت ہے۔ یگانہ نے اس انتساب کے ذریعے اپنی افتادِ طبع ظاہر کردی تھی۔

اس کتاب کے دیباچے میں جو گوہر افشانیاں کی گئی تھیں خاص طور پر مذہب کے بارے میں، وہ اسی چنگیزی فکر کی ترجمان تھیں۔

''غضب تو یہ ہے کہ آزادیٔ فکر، سوچنے اور سمجھنے کا حق بھی مذہب نے چھین لیا۔ وہ یوں کہ مذہب نے اپنی اپنی کتابوں میں جس بات کو جس طور پر سمجھا دیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہ سوچو، نہ سمجھو ورنہ کافر ہو جاؤ گے۔ یہ تو رہی ذہنی غلامی اور انسان کے جسم کو غلام بنالینے کے تو باقاعدہ احکام موجود ہیں اور ان پر عمل بھی ہوتا رہا ہے۔''

(آیاتِ وجدانی، جدید

''فنونِ لطیفہ سے اور رنگ زیب کی نفرت کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ مذہب نے ان کا مذاق خراب کردیا تھا۔''

(آیاتِ وجدانی، جدید

''ہر زمانے میں روز مرہ زندگی کے تلخ تجربے ثابت کرتے رہتے ہیں، مذہب کتنے فسادوں کی جڑ ہے۔''

(آیاتِ وجدانی، جدید

''دیوانے ملاؤں نے مذہب کو اتنا مسخ کردیا ہے کہ تمدن کے لیے وبال ہوگیا''

(آیاتِ وجدانی، جدید

ان مباحث میں کوئی سنجیدہ خیال یا دلائل پیش نہیں کیے گئے تھے۔ تمسخر اور استہزاء کے سوا اور کوئی کام کی چیز نہیں تھی۔ پڑھنے والے کو یہ تاثر فوراً ملتا تھا کہ لکھنے والا محض دل آزاری پر تلا ہوا ہے۔

یگانہ کو اپنے علمی تکبر کی بدولت یقین سا ہو چلا تھا کہ جو کچھ وہ سمجھا ہے وہی حق ہے

اور جو کچھ وہ کہہ رہا ہے بس وہی درست ہے۔اس نے معذرت خواہانہ لہجے یا کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا تھا۔

یہ مسئلہ معاصرین پر تنقید کا نہیں تھا جس پر شور مچتا اور خاموشی چھا جاتی۔مخالفوں کی قطار لگتی تو دو چار ہم نوا بھی مل جاتے۔اس وادی میں کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ یہاں تو ''مرتد'' کی سرکوبی کا سوال تھا۔

لکھنؤ جیسے مذہبی معاشرے میں ان خیالات نے اس کے خلاف عوامی نفرت پیدا کردی۔اس کے خلاف رائے زنی کا دروازہ کھول دیا۔

''جناب، اب یہ مسلمان تو رہا نہیں۔''

''اجی، یہ مسلمان تھا ہی کب۔''

''خیر یہ تو نہ کہیے۔میں نے خود سید سبط حسن صاحب قبلہ کی مجالس عشرۂ محرم میں موصوف کو شریک ہوتے دیکھا ہے۔''

''آپ بھی کس زمانے کی بات کرتے ہیں۔اب اس کے عقائد بدل گئے ہیں۔''

''ارے اُس وقت بھی کون سے درست تھے۔وہ تو اپنے سسر کے ساتھ بہ مجبوری ان مجالس میں چلا جاتا تھا۔''

''اس شخص نے لکھنؤ کی ناک کٹوادی۔''

''سوال یہ ہے کہ اسے سبق کس طرح سکھایا جائے۔''

''ہمیں اس کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔''

روزنامہ انگارہ، لکھنؤ نے ۵۱ء میں اپنی ایک اشاعت میں اشتہار شائع کیا۔

''ہم حکومتِ ہند سے پُر زور مطالبہ کرتے ہیں اور احتجاج کرتے ہیں کہ وہ اولین فرصت میں اس بد بخت مضمون نگار کو جس کا نام یگانہ چنگیزی ہے، گرفتار کرلے اور اس کو سخت

ترین سزا دے۔"

اس کے بعد عام مسلمانوں سے اپیل کی تھی۔

"وہ اس بدزبان، دشمن اسلام، ملحد، کافر، انسان نما شیطان مرزا یگانہ چنگیزی کا مقاطعہ کریں، جلوس نکالیں اور جلسے کر کے حکومت سے مطالبہ کریں کہ اس کے خلاف جلد از جلد قانونی کارروائی کی جائے۔"

اس کے خلاف شہر بھر میں نفرت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ گھر میں بند بیٹھا تھا۔ اس کے بچے پاکستان جا چکے تھے۔ اس تنہائی میں اسے ان کی بہت یاد آ رہی تھی۔ وہ پاکستان جانے کے حق میں نہیں تھا اس لیے اس ذلت کے باوجود ابھی تک لکھنؤ میں تھا البتہ بچوں سے ملنے کے لیے جانا چاہتا تھا۔

ایک دن وہ ہمت کر کے گھر سے باہر نکلا۔ دکان داروں کی پھبتیاں سنتا، نظر انداز کرتا، اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا کہ کسی بالا خانے سے کسی نے "آخ تھو" کیا اور تھوک اس پر پھینک دیا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا، تھوک صاف کیا اور ٹھنڈی سانس بھر کے آگے بڑھ گیا۔

جب یہ حرکتیں روز کا معمول بن گئیں تو اس نے گھر سے باہر نکلنا ہی ترک کر دیا۔ شہر میں دو چار جاننے والے رہ گئے تھے، انہوں نے بھی ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ ایک دن اس کے ایک دوست محمد نقی چھپتے چھپاتے اس سے ملنے آئے۔

"کون صاحب ہیں، بھائی؟" اس نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

"دروازہ کھولیے مرزا صاحب! میں ہوں محمد نقی۔"

یگانہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور مسکرا کر محمد نقی کو گلے سے لگا لیا۔

محمد نقی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ آخر یگانہ نے خود ہی ان کی مشکل حل کر دی۔

''آپ بھی یقیناً یہ فرمانے آئے ہوں گے کہ میں نے ایسی بے باکی سے چند باتیں کیوں لکھ دیں۔''

''کیا مطلب! کوئی اور بھی آیا تھا کیا؟''

''آیا تو کوئی نہیں لیکن اپنے اپنے ظرف کے مطابق تمام لوگ یہی بات کہہ رہے ہیں۔ دکان دار فقرے کستے ہیں، بالا نشینوں پر بیٹھے ہوئے لوگ مجھ پر تھوک پھینکتے ہیں۔ مجھے اور زیادہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ٹھیک ہی لکھا۔''

''مرزا، تمہیں یہ سب نہیں لکھنا چاہیے تھا۔''

''کیوں نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ اسی لیے تو کہتا ہوں، مذہب ہماری آزادی چھین لیتا ہے۔ جو مجھ سے زیادہ مسلمان بنتے ہیں وہ مجھے اتنی بھی آزادی نہیں دے سکتے۔ مجھے اپنی بے عزتی کی پروا نہیں۔ مجھے تو یہ دکھ ہے کہ یہ سب لکھنؤ میں ہو رہا ہے۔ اس سے لکھنؤ کی تہذیب پر حرف آتا ہے۔''

''مرزا، یہ آزادی نہیں کہ ہماری آزادی سے دوسروں کو دکھ پہنچے۔''

''یہ دکھ انہیں تھوڑے دن ہوگا، پھر وہ میری باتیں سمجھنے لگیں گے۔''

''میں تو مرزا یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس سے پہلے کہ بات اور آگے بڑھ جائے، تم خاموشی اختیار کرلو۔''

''آپ میری افتادِ طبع سے واقف ہیں، مجھے گم راہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا۔ میں ہمیشہ وہ کہتا رہوں گا جسے حق سمجھتا ہوں۔''

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اس کا قدم آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ اس کی تلخ بیانی، بدکلامی اور دریدہ دہنی تک پہنچ گئی۔

دنیا کے ساتھ دین کی بے گار الاماں
انسان آدمی نہ ہوا جانور ہوا

صلح ٹھیری تو ہے برہمن سے
کہیں مذہب اڑا نہ دے کوئی ٹانگ

سمجھ میں کچھ نہیں آتا، پڑھے جاؤں تو کیا
حاصل
نمازوں کا ہے کچھ مطلب تو پردیسی زباں
کیوں
ہو

میں پیمبر نہیں یگانہ سہی
اس سے کیا کسر شان میں آئی

خدا کے سامنے دامن پسارنے والے
وہ ہاتھ تھک گئے کیا مال مارنے والے

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظِ مکار ڈراتا ہے مجھے

ان اشعار کو کوئی شاعرانہ ترنگ کہہ کر نظر انداز کر دیتا لیکن جب اس کی نثر کو ان اشعار سے ملا کر دیکھا جاتا تھا تو ایک ایسے آدمی کی تصویر ابھرتی تھی جو مذہب کی عمارت کو ایک آن میں مسمار کر دینا چاہتا ہے۔

اہل لکھنؤ نے اس کا سوشل بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ اہل محلّہ اسے طرح طرح سے تنگ کر رہے تھے۔ دو کم ستر کی عمر ہو چکی تھی، دمے کا مریض تھا، مالی اعتبار سے پریشان۔ پندرہ روپے کی پنشن حیدر آباد سے آتی تھی اور سو روپے ماہوار ادبی وظیفہ حکومت سے ملتا تھا۔

ان پریشانیوں کے باوجود کس بل وہی تھے۔ پورا شہر مخالف تھا لیکن وہ اپنی رائے میں تبدیلی کا خواہاں نہیں تھا۔

زمانے پر نہ سہی دل پہ اختیار رہے
دکھا وہ زور کہ دنیا میں یادگار رہے

اس سے پہلے کہ اس کے خلاف کوئی بڑا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس کے بعض ہمدردوں نے اس کے پاکستان جانے کا بندوبست کر دیا تاکہ وہ بچوں سے بھی مل آئے اور اس کی عدم موجودگی سے ہنگامہ بھی کچھ سرد پڑ جائے۔

وہ پاکستان کے لیے روانہ ہوا تو بیشتر لوگ یہی سمجھے تھے کہ یگانہ فرار ہو گئے حالانکہ سوچنا یہ چاہیے تھا کہ ان جیسے خیالات رکھنے والے کا پاکستان میں کہاں ٹھکانا۔

وہ کراچی آیا تو بیمار تھا۔ علاج اور ملاقاتیں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔

بیشتر لوگ ان قصوں کی روشنی میں اسے دیکھنے آئے تھے جو قصے اس کی ذات سے منسوب تھے۔ اپنی مذہب دشمنی کی شہرت کے باوجود وہ مشہور مبلغ رشید ترابی کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ ملنے والے بھی یہ تاثر لے کر اٹھتے تھے کہ یہ وہ یگانہ تو نہیں ہے۔ جس سے ہم ملنے آئے تھے۔ یہ تو بہت بے ضرر سا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جو دوسروں کی زیادہ سنتا ہے، اپنی کم کہتا ہے۔ اپنی اہمیت جتانے کا اسے کوئی شوق نہیں ہے۔ اس کے ہونٹوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی ہیں۔

اس کے اعزاز میں کئی نشستیں بھی ہوئیں۔ اس بڑھاپے میں بھی اس کے لہک لہک کر پڑھنے کا انداز وہی تھا جس کے لیے وہ شہرت رکھتا تھا۔

کراچی میں کچھ دن گزارنے کے بعد وہ لاہور چلا گیا۔ وہ تو جہاں جاتا تھا کوئی نہ کوئی مصیبت اس کے ساتھ چلتی تھی۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ویزا کی مدت گزر گئی اور اسے خیال ہی نہیں رہا۔ ایک یاددیوم کے زائد المیعاد قیام کے جرم میں زیرِ حراست لے لیا گیا اور

کچھ ایسی پیچیدہ صورتِ حال ہوگئی کہ ہندوستان واپسی شک میں پڑ گئی۔

سفارت خانوں کے درمیان ایک لمبی خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا کی اجازت کے بغیر اب وہ پاکستان نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

اس کی بے کلی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ لکھنؤ جہاں اس کی تذلیل کے سب انتظامات مکمل ہو چکے تھے، اسی لکھنؤ کے لیے وہ مچل رہا تھا۔

ایک ایک سے کہتا تھا کہ خدا کے لیے مجھے لکھنؤ بھیجنے کی سبیل کرو۔ دوارکا داس کو دہلی خط لکھا، جوش کو لکھا، جگن ناتھ آزاد کی خوشامد کی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں سانس نہیں سما رہی ہے، لکھنؤ پہنچ کر وہ گہری گہری سانسیں لینا چاہتا ہے۔ ہندوستان میں جو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ فرار ہو کر پاکستان گیا ہے، اس کی یہ حالت دیکھتے۔ اس کے بچے یہاں تھے لیکن وہ لکھنؤ کے لیے تڑپ رہا تھا۔ لکھنؤ کا سلوک اپنی جگہ لکھنؤ کی کشش اپنی جگہ۔

خدا خدا کرکے، ہندوستان کے دوستوں کی مدد سے گورنمنٹ آف انڈیا کا اجازت نامہ آیا اور اسے لکھنؤ جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ یوں رخصت ہوا جیسے قید سے قیدی رہا ہوتا ہے۔

لکھنؤ کے اسٹیشن پر اُترا سے وہ دن یاد آگیا جب وہ پہلے پہل عظیم آباد سے آیا تھا۔ کس کروفر سے آیا تھا اور اب؟ ٹانگیں کمانیوں کی طرح خم کھا گئی ہیں۔ بلا سے۔ کس بل تو وہی ہے۔

مٹنے مٹنے ہے اب تک اتنا کس بل
جمہور کی ذہنیت کو دیتا ہوں کچل
چنگیز بچہ ہوں شیخ چلی تو نہیں
تاریخ پکارے ہیں ہمیں گریٹ مغل

"کہاں جایئے گا؟" ایک رکشاوالا اس کے پاس آیا۔

"ارے یہ تو اپنے مرزا "مرتد" ہیں۔ایک دوسرے رکشاوالے نے ہانک لگائی۔

"مجھے کون سی بچے کے کان میں اذان دلوانی ہے" پہلے رکشاوالے نے دوسرے کا جواب دیا۔

"کرشاڈھلوانے کا کرایہ بھی لے لینا" دوسرے رکشاوالے نے پھر کہا۔

یگانہ اس نوک جھونک سے محظوظ ہو رہا تھا۔اس کا مطلب ہے میرے لگائے ہوئے زخم ابھی بھرے نہیں ہیں۔

"آیئے میں آپ کو چھوڑ آؤں" رکشاوالے نے کہا "اس سے پہلے کہ آپ ان میں سے کسی کے ہاتھوں صبر وشکر قسم کی کوئی چیز بن جائیں۔"

اس کا رکشا امین آباد سے گزر رہا تھا۔کتنا سکون مل رہا تھا اسے یہاں سے گزرتے ہوئے۔

کششِ لکھنؤ، ارے توبہ!
پھر وہی ہم وہی امین آباد

"صاحب، جب آپ اسلام کے خلاف ہیں تو ہندو کیوں نہیں بن جاتے۔آپ کی کشتی کسی ایک طرف تو لگے" رکشاوالے نے طویل خاموشی کے بعد پوچھا۔

"بھائی، میں ہندو اس لیے نہیں بن سکتا کہ میں مسلمان ہوں۔"

"مگر یہاں تو سب لوگ کہتے ہیں آپ بے دین ہیں۔"

"یہ لوگ اس لیے ایسا کہتے ہیں کہ میں ان جیسا مسلمان نہیں ہوں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مسلمان بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں؟"

"مسلمان ہی تو ہوتے ہیں کئی طرح کے۔"

رکشا والا اس سے آگے کچھ نہیں پوچھ سکا کیونکہ اب رکشا سلطان بہادر روڈ پر آ گیا تھا جہاں یگانہ کی رہائش گاہ تھی۔

لکھنؤ کی ہوا کا اندازہ اسے اسٹیشن پر اترتے ہی ہو گیا تھا۔ دل کا کنول کچھ دیر کے لیے کھلا تھا پھر مرجھانے لگا۔ اس نے پھر ہمت پکڑ لی۔

''یگانہ بن گئی بے ڈھب تو سوچتے کیا ہو۔''

اس نے حریفوں کے دانت پھر کھٹے کرنے شروع کر دیے۔ سنگِ ملامت پھر اس کی طرف آنے لگے۔

مجھ کو یگانہ سنگِ ملامت کا خوف کیا
میں تو وہ پاک شہدہ ہوں سیاں کہیں جسے

اس کے تمام اشعار چھپنے کے لائق نہیں تھے۔ وہ انہیں جان بوجھ کر ایسے ہاتھوں میں پہنچاتا رہا جو انہیں آگے بڑھائیں اور جلتی پر تیل کا کام کریں۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ وہ ایسی چٹکی لیتا ہے کہ حریف تلملا کر رہ جاتے ہیں۔

جب سے وہ پاکستان سے آیا تھا، دوارکا داس سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ آخر ایک دن لکھنؤ سے دلی پہنچ گیا۔

آج وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا جیسے کوئی میدان مار کر آیا ہو۔

''بھئی، پاکستان والوں نے بہت چاہا کہ مجھ ملحد کو وہیں روک لیں لیکن خدا نے میرا پنڈ چھڑایا۔''

وہ پاکستان سے آنے کے بعد بہت خوش تھا۔ اس کی خوشی اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ پندرہ بیس دن وہ دوارکا داس کے گھر رہا اور پورے گھر کو لطیفوں اور دلچسپ قصوں سے ہنساتا رہا۔ پہلے بھی وہ دلی آتا رہا تھا لیکن ایک قسم کی سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ اس مرتبہ تو عالم ہی اور تھا۔ یہ لگتا تھا جیسے جتنی ہنسی اس کے مقدر میں ہے، وہ سب یہاں لٹا کر

جائے گا۔

وہ ہنستا ہوا آیا تھا، ہنستا ہوا لکھنؤ کی طرف روانہ ہوگیا۔

لے چلی وحشتِ دل کھینچ کے صحرا کی طرف
ٹھنڈی ٹھنڈی جو ہوا آئی بیابانوں سے

بہت دن سے اسے کوئی گھر سے باہر نہیں بلاتا تھا، مشاعرے میں کیا بلاتا لیکن اچانک کسی خوش گوار جھونکے کی طرح دلی سے اس کے نام دعوت نامہ آگیا۔

مشاعرہ اور پھر دلی میں! وہاں دوار کا داس شعلہ بھی ہوگا۔ چیڑی اور دودو۔ وہ ایک مرتبہ پھر دلی پہنچ گیا۔

اس کے خیالات سے اتفاق نہ کرنے والے بہت سے تھے لیکن اس کی مضبوط اور منفرد شاعری سے انکار کسی کو نہیں تھا۔ کوئی کچا شاعر ہوتا تو اتنے ہنگاموں میں اس کی گرد بھی نہیں ملتی۔ لوگ اس سے نفرت کرتے تھے لیکن اس کی شاعری کو آرٹ سمجھتے تھے، جدید شاعری کا نقطۂ آغاز گردانتے تھے۔ اس کی انفرادیت کے سب قائل تھے۔

اس مشاعرے میں بھی ہندوستان کا ہر بڑا شاعر موجود تھا۔ ان بڑوں میں ایک بڑا یگانہ بھی تھا جو شاید آخری مشاعرہ پڑھ رہا تھا۔

اس نے غزل شروع کی۔ آج اس کی آواز میں حد سے بڑھ کر سوز تھا۔

جب تک خلشِ دردِ خدا داد رہے گی
دنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی
دنیا کی ہوا راس نہ آئے گی کسی کو
ہر سر میں ہوائے عدم آباد رہے گی
دل اور دھڑکتا ہے ادب گاہِ قفس میں
شاید یہ زبان تشنۂ فریاد رہے گی

شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی
ہر شام ہوئی صبح کو اِک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی
شہرہ ہے یگانہ تری بے گانہ روی کا
واللہ یہ بے گانہ روی یاد رہے گی

اس غزل میں اکڑ اور تیکھے پن کا وہ انداز نہیں تھا۔ اس کے برخلاف ایک سنجیدگی سی طاری تھی۔ اداسی البتہ بہت تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مسافر اپنے سفر کے مشاہدے بیان کر رہا ہے جو زیادہ خوش گوار نہیں ہیں۔ یہ تاثر بھی ابھر رہا تھا کہ وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہے اور جانے سے پہلے، بڑے بجھے دل سے اس دنیا کی تلخیوں کو یاد کر رہا ہے۔

مشاعرے کے بعد جب وہ دلی سے لکھنؤ آیا تو سخت بیمار پڑ گیا۔

بخار کی شدت میں تو چند دنوں کے بعد کمی آ گئی لیکن کھانسی پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ رات رات بھر کھانستا رہتا تھا اور شکر بھیجتا تھا کہ وہ تنہا ہے۔ اگر بچے ہوتے تو کتنے پریشان ہو جاتے۔

کھانسی کی وجہ سے کمزوری بہت ہو گئی تھی۔ ہر وقت چکر سے آتے رہتے تھے۔ اٹھنا بیٹھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

ان دنوں وہ سلطان بہادر روڈ پر ایک حویلی کے اندرونی حصے میں قیام پذیر تھا۔

صدر دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔

"کون ہے بھائی۔ چلے آؤ، دروازہ کھلا ہے۔"

اس کی آواز پر چند لوگ اندر آ گئے۔ چہروں سے قطعی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ کس ارادے سے آئے ہیں۔

یگانہ نے بھی بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔ جواب میں انہوں نے بھی یگانہ کا شکریہ ادا کیا اور کمالِ ادب سے ان کی انسان دوستی اور شاعری کی تعریفیں کیں۔

''حضور، آپ جیسا نابغۂ روزگار لکھنؤ میں ہے اور لکھنؤ والوں کو اس کی قدر ہی نہیں۔''

''کس نے کہہ دیا آپ سے کہ کوئی میری قدر نہیں کرتا، اگر میں زندہ ہوں تو ان کی قدر دانی سے ہوں۔''

''ارے نہیں صاحب۔ آپ بھی بڑے بھولے ہیں۔ قدر دانی اسے نہیں کہتے۔ قدر دانی کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ کو ایک شاندار سواری پر سوار کیا جائے۔ آپ کے گلے میں ہار ہوں اور آپ کو جلوس کی شکل میں شہر کا گشت کرایا جائے۔''

اب یگانہ کا ماتھا ٹھنکا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ یہ اچانک میرے اتنے ہمدرد کہاں سے پیدا ہو گئے۔

''بندہ ہرگز اس قابل نہیں ہے۔ آپ حضرات کا بہت شکریہ۔''

''آپ بہت قابل ہیں۔ آپ کا جلوس ضرور نکلنا چاہیے'' ان میں سے ایک نے کہا اور باقیوں نے مرزا کو تخت سے گھسیٹا۔ سیاہی اپنے ساتھ لائے تھے جس سے منہ کالا کیا، گلے میں جوتوں کا ہار ڈالا اور کھینچتے ہوئے باہر لائے۔ باہر ایک گدھا پہلے سے تیار کھڑا تھا۔ یگانہ کو گدھے پر بٹھایا گیا۔ آن کی آن میں بچے جمع ہو گئے۔ بچوں سے کہا تالیاں بجاؤ اور گدھے کو ہانکتے ہوئے آگے بڑھے۔ یہ گویا مرزا کا شاہانہ جلوس تھا۔

راستے میں بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی جمع ہو گئے۔ اچھا خاصا مجمع لگ گیا۔ جب تک پولیس کو خبر ہوتی، مرزا کا جلوس کئی سڑکوں کی رونق بن چکا تھا۔ پولیس

نے مداخلت کر کے اسے چھٹکارا دلایا۔ پولیس نے چند لوگوں کو گرفتار بھی کیا۔

اس کی شہرت کچھ بھی سہی لیکن وہ ایک شریف شہری اور نامور شاعر تھا۔ دوسرے دن کے ملک بھر کے اخبارات اس واقعے پر شور مچا رہے تھے۔

حکومت چاہتی تھی کہ اس کا جلوس نکالنے والوں کو سزا دی جائے لیکن یگانہ نے انہیں معاف کر دیا تھا اس کا کہنا تھا کہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا دیانت داری سے کیا۔ ان کی عقل انہیں یہی سمجھا سکتی تھی۔

ستر سال سے اوپر کے آدمی کی یہ جگ ہنسائی ہو اور اس کا یہ طرزِ عمل! اس کا چہرہ جذبات سے قطعی عاری تھا۔ وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔

”تمہیں معلوم ہے؟ معلوم ہے تمہیں؟ برسوں پہلے کی بات ہے۔ اس شہر لکھنؤ میں ایک شاعر تھا۔ اس کا نام مصحفی تھا۔ میری ہی طرح بوڑھا ہو چکا تھا، میری ہی طرح باہر سے آ کر لکھنؤ میں آباد ہوا تھا۔ اس کا بھی اسی طرح جلوسِ رسوائی نکالا گیا تھا۔ وہ تو نوابوں کا زمانہ تھا۔ اس وقت تو لکھنؤ کی تہذیبی قدروں کا شباب تھا۔ اس وقت کسی نے مصحفی پر رحم نہ کھایا تو اب تو جمہور کا دور ہے۔ سب کو آزادی ہے۔ جس کا جو جی چاہے کرے۔ غلطی ان کی نہیں میری ہے۔ حق گوئی کی سزا ایسی ہوتی ہے۔“

نظروں پہ چڑھ گئے کیوں ایسے سچے کی کہہ دی
کیوں میرزا یگانہ، کیوں ایسی نوبت آئی

اس حادثے میں اس کا کتب خانہ بھی تتر بتر ہو گیا۔ گئی گزری حالت میں بھی تین سو تین سو نادر کتابیں اس کے پاس رہ گئی تھیں جو دست برد کا شکار ہو کر بازار میں سستے داموں بک گئیں۔ اس کے علاوہ بے شمار تراشے، قلمی مسودے، چند بیاضیں اور دوستوں کے خطوط ایک صندوق میں محفوظ تھے جنہیں نذرِ آتش کر دیا۔

اس لوٹ مار کے بعد اس مکان میں رہنا اس کے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اہلِ محلہ اگر اس کے طرف دار ہوتے تو یہ نوبت آتی ہی کیوں۔

اس کے دوست محمد تقی ایک مرتبہ پھر اس کے کام آئے۔ وہ اسے اپنے مکان میں لے آئے۔ ان کا مکان شاہ گنج میں تھا اور پیلے مکان کے نام سے مشہور تھا۔ مرزا پہلے بھی ایک مرتبہ یہاں چلا آیا تھا اور پھر اپنے مکان میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس حادثے کے بعد وہ پھر پیلے مکان میں آ گیا۔

دنیا کی ہوا کھا کے کیا دند مچائی تھی
بیٹھے ہو یگانہ اب کیوں بزم میں تنہا سے

یگانہ نے ایک دن کہا تھا "میں فتح پاؤں گا تو تنہا اور شکست کھاؤں گا تو تنہا" وہ زندگی بھر تنہا رہا۔ اپنے افکار میں تنہا۔ کوئی اس کا ہم خیال نہ ہو سکا۔ وہ فتح کا زمانہ تھا۔ اب شکست کے دن آ گئے تھے۔ وہ اب بھی تنہا تھا۔ مرتے وقت تک اس کی کوئی اولاد اس کے پاس نہیں تھی۔

اس بے چارگی کے باوجود اس کا حوصلہ مر نہیں گیا تھا۔ وہ تو اس کا قائل تھا۔

دردِ دل صیاد کو کچھ کچھ سنایا چاہیے
گھٹ کے مر جاؤں تو پھر لطفِ گرفتاری نہیں

وہ دردِ دل کو اشعار کے سپرد کرتا رہا۔

صیاد آہ کیا کریں فصلِ بہار میں
دل اختیار میں نہ اجل اختیار میں

کئی طرح کی بیماریاں کمزوری اور بڑھاپے کا سہارا لے کر اس کے ساتھ رہنے لگی تھیں۔ ان میں دمے کی بیماری سب سے زیادہ تکلیف کا باعث تھی۔ جب دورہ سا پڑتا تھا تو

سینے میں سانس نہیں سماتا تھا۔ کھانسنے کی طاقت ہی نہیں تھی، بس ایک دھونکنی سی سینے میں چلتی تھی۔

اس دن کمرے میں وہ تھا اور اس کا ذاتی ملازم۔ تین اور چار فروری کی درمیانی شب تھی۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب اس نے ملازم سے چائے طلب کی۔ چائے پینے کے بعد اس نے سگریٹ سلگایا۔ ابھی ایک دو کش ہی لیے ہوں گے کہ دم الٹ گیا۔

''ہم کئی بار کہے ہیں کہ یہ سسری سگریٹ چھوڑ دیو مگر آپ ہماری بات مانتے ہی نہیں'' اس کے ملازم نے کہا۔

''بے توف! میں جب کسی کے پیچھے پڑ جاؤں تو اسے چھوڑتا نہیں۔ سگریٹ کیسے چھوڑ دوں'' یگانہ نے کھانسی کے وقفوں کے درمیان ملازم سے کہا۔

لیکن ادھ جلا سگریٹ چھوڑنا پڑا۔ ایسی شدید کھانسی اٹھی کہ سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اشارے سے پانی مانگا۔ تھوڑا سا پانی پیا اور لیٹ گیا۔

ملازم مطمئن ہو گیا کہ اس کے صاحب سو گئے۔ وہ بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ملحقہ کمرے میں محمد نقی آرام فرما تھے۔

''ہائے میرے نواب صاحب'' ملازم نے دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔

اس کی آواز سے محمد نقی کی آنکھ کھل گئی۔ یگانہ کی طرف سے دھڑکا تو لگا ہی ہوا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر گھڑی دیکھی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

وہ کمرے میں پہنچے تو مرزا کی رحلت ہو چکی تھی۔ رات میں نہ جانے کس وقت۔

پھیلا کے پاؤں سوئیں گے تربت میں آج ہم
بس اب سفر تمام ہوا گھر قریب ہے

پڑوسیوں کو معلوم ہوا، پھر کچھ سسرالی رشتے دار لکھنؤ میں تھے، ان کو خبر ہو گئی۔ لکھنؤ کے شیعوں کے رواج کے مطابق میت کو غسل خانہ پاٹا نالہ لے جایا گیا۔

ابھی غسال نے غسل دینا شروع کیا تھا کہ چند لوگ وہاں پہنچ گئے۔ ان کا اصرار

تھا کہ اس میت کو غسل نہ دیا جائے جناب سعید الملت کا فتویٰ ہے۔

غسال نے غسل دینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے غسل شروع کر دینے کے بعد روکنا خلافِ انسانیت تصور کیا اور جیسے تیسے غسل مکمل کیا۔

انتقال کی خبر ملتے ہی شہر میں کشیدگی پھیل گئی تھی۔ یہ بات مشہور ہو گئی تھی مرزا کو شہر کے کسی قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا جائے گا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ جنازے کو راستے میں روکا جائے گا۔

یگانہ نے شاید اسی خطرے کے پیش نظر اپنی زندگی ہی میں فاضل حسین کی کربلا واقع تال کٹورا روڈ لکھنؤ میں روضے کے چبوترے پر قبر کے لیے زمین حاصل کر لی تھی۔

لوگ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ جنازے کے ساتھ جانے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ کُل چھ آدمی جن میں ایک نوکر بھی شامل تھا، اس "عظیم" آدمی کے جنازے کو لے کر جا رہے تھے۔ نوریہ گنج کے چوراہے کے قریب پروفیسر مسعود حسین ادیب اپنی کوٹھی سے نکل کر کچھ دیر جنازے کے ساتھ چلے اور پھر واپس اپنی کوٹھی میں چلے گئے۔ اس طرح سات آدمی ہو گئے۔

بہر حال اسے چند آدمیوں کی معیت میں دفن کر دیا گیا۔ وہ چھ سات آدمی جو جنازے کے ساتھ تھے، اس طرح گھروں کو واپس ہوئے جیسے کوئی خزانہ دفن کر کے آ رہے ہوں اور ابھی کوئی راستے میں روک کر پوچھ لے گا کہ بتاؤ کہاں دفن کیا ہے۔

بہت بعد میں اس کی قبر پر ایک کتبہ لگا دیا گیا جس پر سن پیدائش و وفات اور مرزا کا یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے

اخبارات میں اس کی موت کی خبریں شائع ہوئیں تو چھ آدمیوں کی شرکت کا بھی ذکر تھا اور یہ تحریر بھی۔

''حیرت اس بات پر نہیں کہ ان کی میت کے ساتھ چند لوگ تھے بلکہ حیرت یہ ہے کہ یہ لوگ بھی کیوں تھے''

مرزا کے دوست دوار کا داس شعلہ چاہتے تھے کہ مرزا کا پختہ مزار بن جائے۔ انہوں نے کئی دوستوں سے تذکرہ کیا اور پھر سب کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کو خط لکھا۔

مولانائے ما انیاز و سلام شوق۔

آپ مرزا یگانہ کو ضرور جانتے ہوں گے کیونکہ آپ کی نگاہ جو ہر شناس سے کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں۔ شاعر تو وہ تھے ہی لیکن بہ حیثیت انسان کہیں زیادہ بڑے تھے۔ مرزا بے باکی کی حد تک صاف گو تھے، اس لیے دوست پیدا نہ کر سکے۔ ہندوؤں کے نزدیک وہ مسلمان تھے اور مسلمانوں کی نگاہ میں کافر۔

مری خواہش ہے کہ ان کا نشان باقی رہے۔ اگر آپ کی وساطت سے حکومت صرف ان کا مزار اور احاطہ پختہ بنوا دے تو فی الحال کافی ہے۔

مرزا کا مزار فی الحال ایک تودۂ خاک پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے کہ لکھنؤ کی برسات اسے ہموار کر دے، از راہِ کرم ادب و انسانیت کی مدد کیجیے۔

دہلی...... ۱۶ مئی ۱۹۵۶ء

مولانا نے اس خط کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ شاید انہوں نے بھی اس قضیے میں ہاتھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔

کتابیں لٹ گئی تھیں۔ مسودے نذرِ آتش ہو گئے جو بیاضیں بچ رہی تھیں گاؤ خورد

ہوگئیں۔ جو اشعار لوگوں نے تفریح طبع کے لیے یاد کر لیے تھے، فراموش کر دیے۔ ایک ریڈیو اور گھر میں چند دیگر اشیاء تھیں جو بٹ بٹا گئیں۔ یہ ہوا اس کا انجام۔ جو سب سے لڑتا رہا اس کے لیے کون لڑتا۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

مرزا محمد تقی بہت دن تک ایک واقعہ لوگوں کے گوش گزار کرتے رہے۔ یہ ان کی دانست میں مرزا کی صفائی بھی تھی۔

مرنے سے دو دن پہلے مرزا نے کلمہ پڑھا اور مجھ سے پوچھا۔

"کہو بھئی، میں نے کلمہ صحیح پڑھا؟"

"بالکل صحیح!" میں نے کہا۔

"میں مسلمان ہوں؟" انہوں نے پھر پوچھا۔

"آپ صحیح مسلمان ہیں۔"

"میرا ایمان درست؟"

"بالکل درست" میں نے کہا

کون دیتا ہے داد ناکامی
خونِ فرہاد برسرِ فرہاد

بشکریہ ماہنامہ
"سرگزشت" کراچی
اپریل 1999ء

یگانہ کی شاعری

آیاتِ وجدانی کیا ہے اور مشرقی لٹریچر میں اس کا کیا مرتبہ ہے؟ اسکا صحیح فیصلہ موجودہ نسل نہیں کرسکتی۔ ہمیں بس اتنا احساسِ فخر و انبساط کافی ہے کہ مشرق کی ایک زندۂ جاوید شخصیت کا کارنامۂ زندگی پبلک کے سامنے آگیا۔ مصنف کی زندگی کا رنگ بیرنگ دیکھ کر سخت اندیشہ تھا کہ کہیں ادب عالیہ کا یہ سرمایہ گردش روزگار سے پریشان و منتشر نہ ہوجائے۔ الحمدللہ کہ ایسا نہ ہوا۔

موجودہ زمانے کے رواج کے مطابق دیباچہ لکھنا بھی ضرور تھا۔ میں نے اس دیباچہ میں نفسِ شاعری پر بحث کرنے سے دانستہ قطع نظر کی ہے کیونکہ اُردو میں حقیقتِ شاعری پر مولانا حالی۔ علامہ شبلی۔ اور مرزا سلطان احمد صاحب وغیرہ ہم کافی ووافی بحث کرچکے ہیں۔ بے شک مصنف کے خاص اندازِ سخن پر بحث کرنا ضروری تھا مگر میں اس کام کو اوروں پر چھوڑتا ہوں۔ کلام موجود ہے اس پر ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھنے کا موقع ملتا رہے گا۔ سب سے زیادہ ضروری یہ امر تھا کہ مصنف کی شخصیت اور اس کے طرزِ زندگی پر جلد سے جلد روشنی ڈالی جائے تاکہ کچھ دن گزر جانے کے بعد اُس کے سوانحِ زندگی پر پردے نہ پڑجائیں۔ اگلے اساتذہ کے دواوین تو موجود ہیں۔ مگر اُنکے سوانح کے متعلق ہمیں کوئی مفصل اطلاع نہیں ہے۔ اسی لحاظ سے میں نے اس دیباچہ میں مصنف کے حالات اور طرزِ زندگی کو واضح کرنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ اُنکے کیرکٹر اُس کے مطمحِ نظر کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔ اسی وجہ سے میں نے مصنف کے 'فلسفۂ خود پرستی' کو ذرا شرح وبسط سے اس دیباچہ میں بیان کردیا ہے جس سے بہت سے غلط فہمیاں رفع ہوجائیں گی۔ دیباچہ کے علاوہ

'آیاتِ وجدانی' کے متن کے ساتھ ساتھ محاضرات کا دلچسپ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ محاضرات سے میری مراد وہ 'معلومات' اور وہ 'سخن ہائے گفتنی' ہیں جو شعر اور شاعر دونوں سے متعلق ہیں۔ اشعار کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کوئی شرح نہیں ہے بلکہ محض اشارات اور اجمالی رائیں ہیں یا وہ معلومات ہیں جو شعر پڑھ کر شاعر کے مطمح نظر اُس کی شاعرانہ زندگی کے معاملات اس کے اخلاق وعادات کے متعلق یاد آگئیں یا وہ باتیں ہیں جو بر سبیلِ تذکرہ شعر اور شاعر دونوں کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لئے ضروری معلوم ہوئیں۔

اس تمہید کے بعد دیباچے کے سلسلہ میں مصنف کے نام ونسب اور اُسکے ابتدائی حال پر اک نظر ڈالنا چاہئے۔

نام ونسب:

یاس کا نام مرزا واجد حسین تاریخی نام مرزا افضل علی بیگ اور عرف میں میرزا یاس یگانہ لکھنوی مشہور ہیں۔ پہلے یاس تخلص کرتے تھے۔ مگر بعد میں شعرائے لکھنؤ کی لاگ یگانہ تخلص کرنے کا باعث ہوئی۔

نسب نامہ یہ ہے:

مرزا واجد حسین ابن مرزا پیارے صاحب ابن مرزا آغا جان ابن مرزا احمد علی ابن مرزا روشن علی ابن مرزا حسن بیگ چغتائی موخرالذکر بزرگ اپنے بھائی مرزا مراد بیگ کے ساتھ ایران سے ہندوستان آئے۔ مزید وضاحت کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں مصنف کا دادیہالی ننھیالی...... شجرہ بھی درج کر دیا جائے:۔

madblib.org

(دادیہالی سلسلہ)

میرزا مراد بیگ چغتائی (یہ دونوں بھائی ایران سے آئے) میرزا حسن بیگ چغتائی

میرزا روشن علی

میرزا اسد علی　　میرزا واحد علی　　میرزا احمد جان

میرزا میاں جان　　میرزا آغا جان　　میرزا نواب جان

میرزا امیر حسین　　میرزا غلام حسین　　میرزا افضل بیگ

عرف میرزا لاڈلے صاحب　　عرف میرزا پیارے صاحب

میرزا واجد حسین یاسؔ یگانہ

(نانیہالی سلسلہ)

نواب میرزا آغا جان

نواب میرزا علی حسین خاں　　نواب مرزا علی حسن خاں

عرف چھوٹے بابو صاحب　　عرف بڑے بابو صاحب

میرزا محمد حسین　　میرزا جعفر حسین　　منیر بیگم　　عترت فاطمہ بیگم

میرزا واجد حسین یاسؔ

میرزا صاحب کی اہلیہ محترمہ کنیز حسین صاحبہ لکھنؤ کے ایک معزز گھرانے کی خاتون ہیں جن کا سلسلہ یہ ہے:۔

میرزا لطف علی شیرازی عرف آغائی صاحب

مولوی میرزا محمد عسکری	حکیم میرزا محمد تقی	حکیم میرزا محمد شفیع

میرزا محمد فصیح	میرزا محمد رضی	میرزا محمد وصی	کنیز رضا

میرزا یاسؔ یگانہ۔ کنیز حسین

مریم جہان	ام صغری	آغا جان	حسن بانو	آغا شکوہ

میرزا صاحب کی اہلیہ کنیز حسین صاحبہ کی والدہ ماجدہ کنیز فاطمہ صاحبہ بنارس کی تھیں جن کا سلسلہ یہ ہے:۔

حکیم میر محمد باقر صاحب بنارسی

حکیم محمد امیر صاحب

حکیم میرزا محمد شفیع — کنیز فاطمہ صاحبہ

میرزا یاسؔ — کنیز حسین صاحبہ

مرزا صاحب کا مولد خاک پاک عظیم آباد ہے جو حضرت عیسیٰ سے صدیوں پہلے مرکز تہذیب وتمدن تھا۔ اور اب بھی ہے خلجیوں کے وقت سے عظیم آباد اسلامی تہذیب کا مرکز بن گیا سلطنت مغلیہ کے زمانے میں صوبہ کی حیثیت سے مزید ترقی پائی اور عہدِ عالمگیری سے اب تک مرزا عبدالقادر بیدل، مولانا راسخؔ عظیم آبادی، شیخ محمد روشن جوششؔ، راجہ شتاب رائے شتابؔ، راجہ رام نرائن موزوںؔ، راجہ پیارے لال الفتیؔ، شاہ الفت حسین صاحب فریادؔ، مولانا محمد سعید صاحب حسرتؔ، خان بہادر مولانا شادؔ عظیم آبادی، جیسے اساتذۂ فن پیدا ہوئے۔ اس مردم خیز خطہ میں مرزا صاحب کا ظہور ہوا۔ مگر یہ شرف لکھنؤ کی قسمت میں لکھا تھا کہ مرزا صاحب کے حقیقی جوہر وہیں کھلیں گے۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء سے مرزا صاحب نے لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا جہاں آپکی دماغی استعداد نے ارتقائی منزلیں طے کیں۔

لکھنؤ کی سکونت سے پہلے مرزا صاحب کی ابتدائی نشو و نما عظیم آباد ہی میں ہوئی۔ ۱۳۰۱ء میں مرزا صاحب کی ولادت عظیم آباد کے مشہور و معروف محلّہ مغلپورہ میں ہوئی جو سراسر چغتائیوں کا مسکن تھا اور جن کی دھاک شہر بھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہی وہ محلّہ ہے جہاں دہلی کے شاہزادگان ورؤسا رہتے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے دو بھائی مرزا جنگلی اور مرزا مینڈو کی بھی اسی محلّہ میں سکونت تھی۔ یہی محلّہ مرزا صاحب کے بزرگوں کا مسکن تھا۔ مرزا صاحب کے مورثِ اعلیٰ مرزا حسن بیگ چغتائی ایران سے ہندوستان آکر سلطنتِ مغلیہ کے دامنِ دولت سے بسلسلہ سپہ گری وابستہ ہوئے اور اُن کے اخلاف کو پرگنہ حوالی عظیم آباد میں جاگیریں ملیں۔ دو تین پشتوں تک تو تلوار ہاتھ میں رہی پھر سرکار دہلی سے جاگیریں پاکر مغلپورہ میں عیش و اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ پہلے تو تکورئے تھے مگر آخر میں نرے جاگیردار اور گھٹتے گھٹتے زمیندار رہ گئے۔

جاگیروں میں ایک موضع فہیم پور مرزا صاحب کے ہوش سنبھالنے تک سلامت تھا مگر آئے دن کی مقدمہ بازی کے ہاتھوں خالصے لگ گیا۔ مرزا صاحب کے والد ماجد مرزا پیارے صاحب اسی مقدمہ بازی میں تباہ رہے۔ اسی وجہ سے مرزا صاحب کو باپ کی طرف سے بجز چند مکانات کے حصہ نہ ملا۔ جو کچھ ملا وہ اُن کی پھوپھی امتہ الزہرا بیگم صاحبہ کی طرف سے ملا کیونکہ پھوپھی نے لڑکپن سے مرزا صاحب کو گود لیا تھا۔ پھوپھی نے اتنی جائداد چھوڑی تھی جس سے دس بارہ برس تک فراغت سے بسر ہوتی رہی۔

ابتدائی تعلیم:

مرزا صاحب کی ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرتؔ عظیم آبادی کے مدرسہ واقعہ محلّہ مغلپورہ میں ہوئی جہاں مولوی وزیر علی صاحب رنگپوری اور مولوی محمد عظیم صاحب پشاوری سے مرزا صاحب نے درسیاتِ فارسی کی تکمیل کی۔ فارسی کی تکمیل کے بعد

مرزا صاحب عظیم آباد کے مشہور و معروف محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوئے اوّل سے آخر تک وظیفے اور تمغے اور انعامات پاتے رہے اور ۱۹۰۳ء میں فارغ التحصیل ہوکر نکلے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی اعظم علی خاں صاحب اور اُن کے استاد مولوی سید علی خاں صاحب بیتابؔ نے نہایت شفقت و توجہ سے مرزا صاحب کی تعلیم کی۔ مرزا صاحب کی صحیح دماغی نشو و نما مذاقِ شاعرانہ کی اصلاح اور رموزِ فصاحت و بلاغت کی تعلیم بھی مولونا بیتابؔ ہی نے فرمائی۔ مولانا بیتابؔ کو اپنی مصروفیتوں کے باعث فرصت کم رہنے لگی تو آپ نے مرزا صاحب کو اپنے استاد مولانا شادؔ کے سپرد کر دیا۔ یہاں کی صحبت اک دریائے فیض تھی جہاں بیٹھ کر چند ہی روز میں فکرِ رسا کو پر لگ گئے۔

۱۹۰۴ء میں مرزا صاحب نے کلکتہ اور مٹیا برج کا سفر کیا۔ مٹیا برج میں شہزادہ مرزا محمد مقیم بہادر کے دو مرشد زادوں نواب محمد یوسف علی مرزا اور نواب محمد یعقوب علی مرزا کے اتالیق ہوئے۔ مگر مٹیا برج کی آب و ہوا نے آپ کی صحت پر ایسا خراب اثر کیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں علیل ہوکر عظیم آباد واپس چلے آئے اس علالت کا سلسلہ قریباً سال بھر تک جاری رہا۔ صحت کی حالت اس درجہ سقیم ہوگئی کہ مرزا صاحب کو امیدِ زیست باقی نہ رہی۔ آخر کار گھبرا کر لکھنؤ تشریف لائے اور یہاں جھوائی ٹولہ میں قیام کرکے حکیم محمد عبدالعزیز صاحب لکھنوی سے رجوع کیا لکھنؤ کی آب و ہوا اور وہاں کی دلچسپیوں کا مرزا صاحب پر اتنا خوشگوار اثر ہوا کہ ترکِ وطن کرکے لکھنؤ کو وطن بنالینے کا قصد مصمم کرلیا۔ پھر تھوڑے دنوں بعد عظیم آباد تشریف لے گئے اور وہاں اپنی جائداد کا کچھ حصہ فروخت کرکے لکھنؤ واپس آگئے اور یہیں مستقل طور پر رہنے لگے۔ یہاں قدرتاً شعر و شاعری کے مشغلہ میں زیادہ انہماک رہنے لگا۔ مشاعروں میں مرزا یاسؔ کی دھوم ہونے لگی۔ ۱۹۱۳ء میں مرزا صاحب کی شادی لکھنؤ کے اک معزز گھرانے میں ہوئی۔ حکیم مرزا محمد شفیع شیرازی جن کا نام شجرہ میں درج ہے لکھنؤ محلہ شاہ گنج کے رہنے والے شہر کے نہایت پرہیزگار و دیندار لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ

کے بڑے بھائی مولوی مرزا محمد عسکری صاحب نے کربلائے معلّٰی میں آخری زندگی بسر کی اور منجھلے بھائی حکیم مرزا محمد تقی صاحب نخاس میں مطب کرتے ہیں۔ شہر کے مشہور اطبا میں ہیں۔ حکیم محمد شفیع صاحب کی پہلی بیوی کنیز فاطمہ صاحبہ کی چھوٹی صاحبزادی کنیز حسین صاحبہ مرزا صاحب کو منسوب ہیں۔ عقد میں نواب محمد عسکری مرزا خاں صاحب عرف ہن صاحب بلیغ بھی شریک تھے۔ شادی کے متعلق اک قطعہ تاریخ جو آپ نے فرمایا تھا۔ وہ ذیل میں درج ہے:۔

سامانِ جشنِ دید ہے مدِ نظر کہیں ۔۔۔ چھائی ہوئی اُداسیاں ہیں چہرے پر کہیں
اللہ رے شوق گو کہ سرِ شام ہے ابھی ۔۔۔ خلعت پہن چکا کوئی رشکِ قمر کہیں
عشرت کدے میں دل کو عروسانہ ہیں خیال ۔۔۔ رکھا ہوا ہے شرم سے زانو پہ سر کہیں
آئی مراد گھی کے جلائے گئے چراغ ۔۔۔ سہرے کے پھول چننے لگے دیکھ کر کہیں
ابتک دماغ بستے ہیں عطرِ عروس سے ۔۔۔ جس راہ سے ہوا ہے کسی کا گزر کہیں

لکھے ہیں بہر یاد سن عیسوی بلیغ
ہے جشنِ عقدِ یاسؔ کا مدِنظر کہیں

۱۹۱۳ء

شادی کے بعد ۱۹۱۳ء میں مرزا صاحب نے اپنا مجموعہ نثرِ یاسؔ شائع کرایا جس پر اساتذۂ لکھنؤ یعنی حضرت اوجؔ، عارفؔ، رشیدؔ وغیرہم نے پُرزور تقریظیں لکھی تھیں۔ شاعری کے میدان میں لاگ ڈانٹ تو پہلے ہی سے شروع ہوگئی تھی اب ان تقریظوں کو دیکھ کر تمام شعرائے لکھنؤ میں آگ لگ گئی اور یہ چرچے ہونے لگے کہ اساتذۂ لکھنؤ نے مرزا یاسؔ کو مسلم الثبوت سخنور مان کر اہلِ لکھنؤ کی ناک کاٹ لی۔ اُس زمانہ میں یورپ کی جنگ چھڑ چکی تھی۔ ادھر لکھنؤ میں مرزا یاسؔ اور اہلِ لکھنؤ کی کاغذی جنگ کا بھی زور بندھ گیا۔

۱۹۱۹ء میں مرزا یاسؔ نے عروض وقوافی میں ایک رسالہ چراغِ سخن لکھ کر حریفوں کے دانت اور کھٹے کر دیے۔ غرض اب عداوت وبغض کا دروازہ کھل گیا اور روز بروز یہ فتنہ بڑھتا ہی گیا۔ مگر ان عداوتوں کا اُلٹا اثر ہوا۔ مرزا صاحب سا شخص جس کی نگاہ میں کسی سلطنت کی مخالفت بھی سما نہیں سکتی وہ ان حاسدین کی مخالفتوں کو خاطر میں کیا لاتا۔ ان حسد شعاریوں نے مرزا صاحب کے دشمنوں کی کمزوریوں کا یقین دلا دیا اور اسی کے ساتھ اُن کی خود پرستی کی نشو ونما ہوتی گئی۔ مرزا صاحب خواجہ آتشؔ کے فدائیوں میں ہیں اور غالبؔ کے بھی بڑے معتقد تھے مگر جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اُن کے حریف جو غالب کے مرتبہ سے قطعاً نا آشنا ہیں جھوٹ موٹ غالب کی تعریفیں کیا کرتے ہیں اور خواہ مخواہ خواجہ آتشؔ پر منہ آیا کرتے ہیں "پھر مقامی ضرورتوں نے انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ غالبؔ کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔ یہیں سے غالبؔ پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور یہیں سے مرزا یاسؔ کی خود پرستی کی بنیاد پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تمام ذمہ داری اہلِ لکھنؤ پر ہے کہ انہوں نے مرزا یاسؔ ایسے آتش پرست کو خود پرست بنا دیا۔ اب ذرا وضاحت کے ساتھ ہم مرزا صاحب کے فلسفۂ خود پرستی پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

خود پرستی کی فلاسفی

(A lesoon for thinkers only)

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاسؔ کس دن کیلئے ناحق پرستی کیجئے

"اظہار فضیلت جسے پبلک اپنی غلط فہمی و جلد بازی سے خود پرستی خودستائی پر محمول کرتی ہے اک ناگوار تبلیغی فرض ہے ناواقف وکوتاہ بین جماعت کی تلقین وہدایت کے لئے یہ ناگوار تبلیغی فرض (خود

پرستی) بڑے بڑے پاک باطن ریفارمروں کو بھی ادا کرنا پڑا ہے (A

(Thinker

استاد[1] فرزانہ مرزا یاس یگانہ لکھنوی عظیم آبادی کی شخصیت بھی عجیب وغریب ہے۔ دیکھنے میں اک سڑی سودائی دیوانہ مگر یکتائے زمانہ۔ بظاہر خستہ و مضمحل مگر پہلو میں شیر کا دل۔ پریشان روزگار۔ آوارہ کوچہ و بازار۔ مگر دل کا غنی بات کا دھنی۔ سخنور بالا دست۔ نشۂ کمال میں مست۔ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ لکھنؤ میں اپنے سوا کسی کو موجود نہیں جانتا۔ لکھنؤ کے حشرات الارض کو ہیچ و پوچ سمجھنے والا غالبؔ ایسے استاد پر بیدھڑک نکتہ چینی کرنے والا مگر اس کے ساتھ ہی غالبؔ کی آخری عمر کے کلام پر مرنے والا۔ میر انیسؔ، میر تقی میرؔ، مرزا سودا، خواجہ آتشؔ لکھنوی اور اکبرؔ آبادی کا دم بھرنے والا اور پھر اتنا خود پرست سمجھا جائے یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ بادی النظر میں جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یہی اصل حقیقت ہے یا ہماری نظر کا دھوکا ہے۔

یہ راز پبلک کی سمجھ میں آیا ہے نہ آئے گا کہ یہ خود پرستی ہے یا اس کی تہ میں کوئی گہری فلاسفی پنہاں ہے۔ اور اگر یہ خود پرستی بھی ہے تو کیسی ہے مذموم ہے یا ممدوح۔ جو لوگ اس دیوانہ شناس مرزا یاسؔ کی تحریروں کو محض سرسری نظر سے دیکھ کر بیدھڑک فیصلہ کرلیتے ہیں کہ یہ شخص بڑا مغرور اور خود پرست ہے انہیں کم از کم جھوٹی تسلی تو ضرور ہو جاتی ہے اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم صحیح نتیجہ پر پہنچ گئے مگر مشکل اُن لوگوں کے لئے ہے جو اس خود پرستی کی تہ کو پہنچنا چاہتے ہیں اُن کا دل تو یہ گواہی دیتا ہے کہ ایسا شخص جس کی ذات میں مبداء فیاض نے یہ جوہر سخنوری ودیعت کئے ہیں وہ غالبؔ یا اور کسی باکمال کا منکر ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر سخنور دوسرے سخنور کا اعترافِ کمال کرنے پر فطرۃً مجبور ہے اعترافِ کمال بھی اک قانونِ قدرت ہے جس کے عمل سے مرزا یاسؔ کی ذات مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ اس اٹل قانون کو پیش نظر

---

1 فلسفہ خود پرستی، نوشتہ مولانا تجلی بی اے

رکھ کر اور مرزا صاحب کے شاعرانہ فضل و کمال کو تسلیم کرتے ہوئے اُن کی خود پرستی کا معما حل نہیں ہوتا۔ اس راز کو کم سے کم موجودہ نسل تو نہ سمجھ سکے گی۔ نہ پبلک کو اتنا موقع ہے کہ اس راز کے دریافت کرنے میں کافی وقت صرف کر سکے۔ نہ اس راز کو دریافت کرنے کی اہمیت اس زمانہ کی پبلک کو محسوس ہو سکتی ہے۔ البتہ اس نسل کے بعد آیندہ نسلوں کو اس خود پرستی کی فلاسفی پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔

عدالتوں میں روز مرہ جو چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مقدمات پیش ہوتے رہتے ہیں اُن کی تحقیق و تفتیش اور جانچ پرتال میں کتنی کوششیں ہوتی ہیں کتنا وقت صرف ہوتا ہے کتنے دماغ مصروف رہتے ہیں کتنی بڑی بڑی مسلیں تیار ہوتی ہیں۔ ماتحت عدالتوں سے لے کر عدالتِ عالیہ تک کتنے مرحلے طے کرنا پڑتے ہیں جب کہیں ایک مقدمہ کا فیصلہ انصاف و صحت کے ساتھ ہوتا ہے۔ مرزا یاس کی خود پرستی کے معاملہ میں پبلک جو چاہے کہے مگر یہ واضح رہے کہ کسی امر میں محاکمہ کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ جب تک مقدمہ کی مسل کا مطالعہ شروع سے آخر تک بامعانِ نظر نہ کیا جائے گا اس وقت تک صحیح نتیجہ پر پہنچنا محال ہے۔ پبلک جب شرائطِ تحقیق ہی بجا نہیں لا سکتی مقدمہ کی کافی تحقیقات ہی نہیں کر سکتی۔ پبلک کے پاس جب اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ وہ اس خود پرستی کے اسباب و علل اور اس کی فلاسفی پر غور کر سکے۔ پبلک کو جب یہی نہیں معلوم کہ اس خود پرستی کی ابتدا اور اس کی نشو و نما کب اور کیونکر اور کس ماحول میں ہوئی۔ پبلک کو جب اس بات کی خبر ہی نہیں کہ خود لکھنؤ کی فرعونیت اور حماقت نے مرزا یاس کو آتش پرست سے خود پرست ہو جانے پر مجبور کر دیا تو ایسی بے خبری و ناواقفیت کی حالت میں پبلک کو محاکمہ کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ رائے زنی کرتے وقت کوئی کسی کی زبان تو پکڑ نہیں سکتا مگر ایسی رائے زنی جو ناواقفیت یا ناقص معلومات پر مبنی ہو کہاں تک حق بجانب کہی جا سکتی ہے۔ فقط یاس صاحب کی تحریروں کو سرسری نظر سے دیکھ کر اُن کی خود پرستی کو بے جا ٹھہرانا اور اپنے ناقص فیصلہ کو صحیح سمجھ لینا اہلِ

تحقیق کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ مرزا یاسؔ کی خود پرستی کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے نگاہ میں وسعت پیدا کرنے اور صفحاتِ تاریخ سے مدد لینے کی ضرورت ہے بغیر اس کے صحیح نتیجہ پر پہنچنا معلوم۔

صفحاتِ تاریخ شاہد ہیں کہ جب کبھی دنیا میں کسی مصلح یا ریفارمر کا ظہور ہوا ہے جس نے دنیا میں آ کر کچھ کارنمایاں کئے ہیں۔ رسمیاتِ بیہودہ، معتقداتِ فرسودہ اور توہماتِ باطلہ کی اصلاح اور پبلک کے دماغ کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ہے تو اُس کے خلاف ہمیشہ انواع واقسام کے طوفانِ بغاوت اُٹھتے رہے ہیں۔ ملک وملت کی طرف سے اُس کو جاہل، بے ایمان، دغاباز، فتنہ پرداز وغیرہ وغیرہ خطابات ملتے رہے ہیں مگر وہ کبھی اپنے مشن کو پبلک کے خوف سے ترک یا ملتوی کرنا گوارا نہیں کرتا۔ ذلت ورسوائی گوارا کرتا ہے ایذائیں اُٹھاتا ہے انواع واقسام کی قربانیاں کرتا ہے مگر اپنے مشن سے باز نہیں آتا۔ اثنائے جدوجہد میں اُسے یہ ضرورت بھی پیش آتی ہے کہ وہ ناواقفوں اور کوتاہ اندیشوں کو اپنی خداداد بزرگی وفضیلت سے آگاہ کرے وہ کھلے کھلے لفظوں میں اپنی زبان سے اپنی خداداد قابلیت کا اظہار کر کے اتمامِ حجت کرتا ہے۔ اس اتمامِ حجت واظہارِ فضیلت پر وہ اپنی قوم کے ہاتھوں نشانۂ ملامت ہوتا ہے دشنام سنتا ہے۔ دربدر خاک بسر ہوتا مگر اپنے مشن سے باز نہیں آتا۔ اب اسے تم اُس کی خودستائی وخود پرستی سمجھو یا اک تبلیغی فرض مگر یہ ناگوار فرض ادا ہی کرنا پڑتا ہے۔

مذہبی ریفارمر ہو یا ملکی، اخلاقی ریفارمر ہو یا ادبی ہر ایک کو اپنی زندگی میں یہ ناگوار فرض (جسے تم خودستائی سمجھو گے) ادا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دور کیوں جاؤ، مرزا غالبؔ ہی کو دیکھ لو۔ غالبؔ کون تھا؟ ایک ادبی ریفارمر تھا جو مبداءِ فطرت سے دنیائے شعر وسخن میں ایک خاص مشن لے کر آیا تھا۔ کیا غالبؔ کو نادان وبے خبر پبلک کے سامنے اس ناگوار فرض (خودستائی) کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیا غالبؔ نے خودستائی اور اپنے

معاصرین پر حملہ کرنے اور اُنکی قلعی کھول دینے میں کوئی کسر اٹھا رکھی۔ میر تقی میر کی زندگی اسی خود پرستی کی بدولت جتنی تلخ ہوگئی وہ کیا آپ کو معلوم نہیں عرفی کے فضل وکمال کا کون منکر ہوسکتا ہے مگر کیا اس سے بڑھ کر کوئی مغرور وخود پرست گزرا ہے۔ یہ تو سب کے سب ادبی ریفارمر تھے ان کا ذکر کر چھوڑیئے ذرا امام وپیغمبر کے طرزِ عمل پر نظر کیجئے۔

کیا امام وپیغمبر کو نادان پبلک کے سامنے یہ ناگوار فرض (خودستائی) ادا نہیں کرنا پڑا۔ آنکھیں کھولئے اور غور سے دیکھئے۔ یاس عظیم آبادی کی نسبت یہ کہنا کہ "اس خود پرستی کی کیا ضرورت ہے آپ میں کوئی جوہر ہوگا تو پبلک خود ہی پرکھ لے گی" ذرا غور تو کرو کہاں تک ٹھیک ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؑ نے خطبۂ شقشقیہ میں جو اپنے محامد واوصاف اس شدومد سے بیان فرمائے ہیں۔ تم کہو گے کہ اس خودستائی کی کیا ضرورت تھی اگر آپ میں کوئی جوہر ہوتا تو پبلک خود اعتراف کر لیتی۔ مگر ذرا غور وفکر وانصاف سے کام لوگے تو معلوم ہوگا کہ پبلک کی ہدایت وتلقین کے لئے اس خودستائی (جسے اہلِ تحقیق کبھی خودستائی نہیں کہہ سکتے) اور اتمامِ حجت کی ایسی ہی ضرورت تھی جیسی اور فرائض کی۔ یہ ایک ناگوار تبلیغی فرض تھا جو علی مرتضیٰؑ ایسے پاک نفس کو بھی ادا کرنا پڑا۔ آج کوئی شخص اس حقیقت کو کیا سمجھ سکتا ہے یا اُس وقت کے ناواقف وبے خبر عوام الناس کیا سمجھ سکتے تھے کہ کن حالات وواقعات اور کس ماحول سے متاثر ہوکر اور کن مصلحتوں کی بنا پر علی مرتضیٰ کو ایسا کرنا پڑا۔

رسول اللہ کو اس کیا کہا ضرورت تھی کہ (انا مدینۃ العلم وعلی" بابہا میں شہرِ علم ہوں اور علیؑ اُس کا دروازہ ہیں) کہہ کر خودستائی کے مرتکب ہوں۔ (معاذ اللہ خاکم بہ دہن) اگر آپ میں یہ علم وفضل تھا تو پبلک خود اعتراف کر لیتی خودستائی کی ضرورت کیا تھی۔ اک جاہل وبے خبر معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اک امّی محض کو اتنا بڑا دعویٰ کرنا (انا مدینۃ العلم) کہاں تک زیبا ہے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مگر بندہ نواز جو لوگ حقیقتِ حال کی خبر نہیں رکھتے جو غور کرنے کی زحمت نہیں اُٹھا سکتے وہ اس کی ضرورت کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ ہمیں جب اپنے گردو

پیش کی صحیح معلومات میسر نہیں تو ہم اُس وقت کے ماحول کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ پبلک کو جب یہی نہیں معلوم کہ مرزا یاسؔ نے لکھنؤ کے خطرناک و پرآشوب ماحول میں کیسی تلخ زندگی بسر کی ہے اور لکھنؤ کی فرعونیت کہاں تک مرزا یاسؔ کی خود پرستی کی محرک ہوتی رہی ہے تو اس حکیمانہ خود پرستی کی داد کیا دے سکتی ہے اور اس خود پرستی کی اہمیت اور اس کی اشد ضرورت کا کیا اندازہ کر سکتی ہے۔

مولائے مرتضیٰؑ اور سید الشہداء جناب امام حسینؑ سے زمانہ کیوں پھر گیا۔ پبلک نے آپ کا ساتھ کیوں نہ دیا۔ کیا ان بزرگواروں کے اخلاق ناپسندیدہ تھے کہ پبلک اُن سے پھر گئی؟ استغفر اللہ، بات یہ تھی کہ ان بزرگواروں کی زندگی کا مشن یہ نہ تھا کہ خواہ مخواہ بھی نادان و کج فہم پبلک کی ناروا خواہشوں اور بیجا توقعات و جذبات کی ہمنوائی کریں۔ پبلک کے خوف سے اپنے فرائضِ اخلاقی سے چشم پوشی کریں یہ بزرگوار دنیا میں اس لئے آئے تھے کہ پبلک کو اپنے معیارِ اخلاق پر کھینچ لائیں نہ اس لئے کہ گمراہ پبلک کے ہم آہنگ و ہمنوا ہو کر زمانہ سازی کے مرتکب ہوں (خاکم بدہن) اور اپنے مشن کو بھول جائیں اُن کا مشن یہ نہ تھا کہ عوام کی نگاہ میں جھوٹی عزت حاصل کر کے ہر دلعزیز بنیں پبلک کو گمراہی و ضلالت میں چھوڑ کر اور اپنا ہوا خواہ بنا کر چین سے زندگی بسر کریں دنیاوی آرام و آسائش کے لالچ میں اپنے مشن کو ترک کر دیں۔ یہ بزرگوار پبلک میں ہر دلعزیز بن کر دوسروں کو دھوکے میں رکھنے اور خود اپنے تئیں دھوکا دینے کے لئے نہیں پیدا ہوئے تھے بلکہ فرائضِ انسانی بجالانا اور دوسروں کو ان فرائض کی تعلیم دینا ان کا نصب العین تھا۔ اسی پابندی فرائض اور اپنے مشن کے احساسِ ذمہ داری کا نتیجہ یہ تھا کہ پبلک اُن سے پھر گئی اور پھر جو کچھ ایذائیں اور ذلتیں (خاکم بدہن) ان بزرگواروں کو اٹھانا پڑیں وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ کیا اُس زمانہ میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں گے جو یہ الزام رکھتے ہوں گے کہ علی مرتضیٰؑ اور امام حسینؑ نے پبلک کو اپنا مخالف بنا کر اپنی ناقابلیت و ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا اور آپ اپنی زندگی تلخ

کرلی۔ مگر کیا کیجئے اُن کا مشن ہی ایسا تھا جو زمانہ سازی کے اصول کو جائز نہیں رکھتا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو شخص اپنی اصلاح و تہذیب نفس کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اپنا ہی سا فرض شناس دیکھنا چاہتا ہے اُسے ابنائے زمانہ کے ہاتھوں ایذائیں اٹھانا ہی پڑتی ہیں اسی کے ساتھ اُسے یہ ضرورت بھی پیش آتی ہے کہ وہ کج فہم پبلک کو اپنے مرتبہ اور اپنے مشن سے آگاہ کر کے اتمامِ حجت کر دے اس ایذا پسندی میں اُسے وہ لذت ملتی ہے جس پر دنیا کی ہزار ہا لذتیں صدقے ہیں۔ یوں تو جعلساز دغا باز، چور اُٹھائی گیرے بھی اپنے اپنے کرتوت سے ایذائیں اُٹھاتے ہیں۔ رسوا ہوتے ہیں مگر انہیں وہ روحانی لذت کیا نصیب ہوسکتی ہے جو ایک فرض شناس کو سختیاں اُٹھا کر حاصل ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے ابنائے زمانہ کی نگاہوں میں محض جھوٹی عزت مصنوعی اور عارضی خوشی حاصل کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے وہ ان حکیمانہ ایذا پسندیوں کی لذتوں کا اندازہ کیا کر سکتے ہیں تا در نہ آئی نہ دانی۔ یہی وہ لذت ایذا طلبی ہے۔ جس کی طرف مرزا صاحب نے اشارہ فرمایا ہے:

مزے کیساتھ ہوں اندوہ و غم تو کیا کہنا
یقین نہ ہو تو کرے کوئی امتحان اپنا
یاسؔ

مرزا صاحب کے ذکر کے ساتھ امام پیغمبر کا ذکر اس راہ سے نہیں کیا گیا ہے کہ معاذ اللہ مرزا صاحب بھی امام پیغمبروں کے زمرے میں داخل ہیں بلکہ یہ ذکر اس مصلحت سے کیا گیا کہ خود پرستی یا اظہار فضیلت (جو ایک تبلیغی فرض ہے) کی ضرورت ذہن نشین ہو جائے اور ناواقفوں کو معلوم ہو جائے کہ امام پیغمبر بھی یہ ناگوار فرض ادا کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

اس ادبی ریفارمر کو بھی مقامی ضرورتوں نے (یعنی لکھنؤ کی فرعونیت و حماقت) اظہار فضل و کمال اور مرزا غالبؔ کے خلاف کتہ چینی کرنے پر مجبور کیا۔ ورنہ کیا مرزا صاحب اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ خود پرستی اور غالبؔ پر نکتہ چینی لوگوں کو بُری معلوم ہوتی ہوگی۔ مگر وہ اس

رازِ حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ وہی خود پرستی جو عام طور پر مذموم سمجھی جاتی ہے ایک خاص وقت پر اور خاص خاص ہستیوں کے لئے جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہو جاتی ہے۔ تم اگر مرزا صاحب کی پوزیشن میں ہوتے تو بغیر سمجھائے سمجھ جاتے کہ لکھنؤ کی فرعونیت کا علاج خود پرستی کے سوا اور کچھ نہیں۔ لکھنؤ والے اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کی فرعونیت خاموشی کے ساتھ ٹال دی جائے بلکہ اُن کی سرکوبی فرض ہے۔

عوام کا ذکر نہیں اہلِ تحقیق جب غور و فکر کے ساتھ مرزا یاسؔ کی شخصیت کا مطالعہ کریں گے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ شخص بد و فطرت سے دنیائے شعر و سخن کے لئے ایک خاص مشن لے کر آیا ہے۔ پبلک کو اپنے مذاقِ سخن اپنے معیارِ حریت و صداقت کی طرف کھینچنا چاہتا ہے۔ اس مصلحانہ مشن اور احساسِ ذمہ داری کا تقاضا یہی ہونا چاہئے تھا کہ مرزا صاحب منکروں کو اپنی شخصیت سے آگاہ کر کے اتمامِ حجت کرتے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اب اسے تم خود پرستی کہو یا ادائے فرض۔ تم کو کیا معلوم کہ فراعنہ لکھنؤ کی چشم نمائی کے لئے خود پرستی کی اور اُن کے دماغ سے مادہائے فاسد کو خارج کرنے کے لئے کس قدر تند و تیز و تلخ جلاب دینے کی ضرورت ہے۔ اگر تم مرزا صاحب کی پوزیشن میں ہوتے اور محسودِ عصر ہو کر حاسدوں کی نگاہ میں خار بن کر کھٹکنے کی قابلیت رکھتے اور لکھنؤ میں رہ کر ایسی تلخ و خطرناک زندگی بسر کرتے۔ عوام کی نگاہ میں جھوٹی ہر دلعزیزی حاصل کرنے اور چین سے خود غرضانہ زندگی بسر کرنے کے بدلے تم دوسروں کے لئے کوئی اصلاحی مشن لائے ہوتے تو تم اس حقیقت کی تہ کو پہنچ سکتے کہ مرزا صاحب کس خطرناک ماحول میں کس ثابت قدمی سے اپنے مشن پر قائم رہے ہیں اور جس ناگوار فرضِ تبلیغی کو تم خود پرستی سے موسوم کرتے ہو وہ کتنا اہم اور ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عوام کے علاوہ مرزا صاحب کے بعض سچے ہمدرد بھی خواہ بھی اس خود پرستی کو اُن کے حق میں مُضر سمجھتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس خود پرستی کی بدولت مرزا صاحب نے بہت کچھ ایذائیں اُٹھائیں اور اُٹھا رہے ہیں۔ بہت سے مادی فوائد جو

زمانہ سازی کی بدولت حاصل ہو سکتے تھے وہ اس خود پرستی کے ہاتھوں حاصل نہ ہوئے مگر کیا کیجئے مرزا صاحب کی نظر آج سے زیادہ کل پر ہے۔ مولانا نثار صفوی نے کیا خوب فرمایا ہے۔

خدا ہی اُس دلِ آگاہ کو صلہ بخشے
جو آج چھوڑ کر کل کا امیدوار رہے
نثار

مرزا صاحب کے دلسوز و ہمدرد جو اس خود پرستی کو باعث منفرف سمجھتے ہیں اُن کے خلوص و محبت میں کوئی کلام نہیں مرزا صاحب کو انواع واقسام کی ایذاؤں میں گھرا ہوا دیکھ کر اُن کا دل دُکھتا ہے مگر اُن کے دوستوں کو اس امر کا کافی اندازہ نہیں ہے کہ اس شخص کو ایذا طلبی میں کیا لذت ملتی ہے۔ انہیں اس کی خبر نہیں ہے کہ اس خود پرستی و ایذا طلبی کے کیا کیا اہم نتائج ظہور میں آنے والے ہیں۔ مرزا صاحب کی موجودہ حالت زار پر نظر کرتے وقت اُن کے احباب اس حقیقت کو سہو کر جاتے ہیں کہ اس چندروزہ زندگی کے بعد ایک حیات بعد الممات بھی ملنے والی ہے جو بغیر ایذا طلبی کے ممکن نہیں۔

مرزا صاحب کے دوستوں کا جو اہم فرض ہے وہ یہ ہے کہ شعر وسخن اور طبقہ شعراء کے لئے جو اصلاحی مشن مرزا صاحب کو انجام دینا ہے اُس میں ہاتھ بٹائیں۔ اور اس مشن میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں رفع کریں۔

شعر وسخن سے متعلق مرزا صاحب کا مشن یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے لہٰذا دیگر مخلوقات سے زیادہ اور بہت زیادہ مطالعہ انسان ہی کا کرنا چاہئے انسان کی اندرونی و بیرونی دنیا اور اُس کی زندگی مختلف پہلوؤں پر نظر کی جائے۔ انسان کی ظاہری حالت سے زیادہ اُس کی باطنی حالت پر زورِ قلم دکھایا جائے فلسفۂ فطرت انسانی کے باریک نکتے شاعرانہ انداز سے حوالۂ قلم کئے جائیں مختصر یہ ہے کہ انسان ہی کو شاعری کا موضوع قرار دیا جائے۔ انسان کے علاوہ مچھر کھٹمل، کتے، بلی، گائے، بھینس، بندر، ساگ پات، آم خربوزے،

دریا سمندر کوہ و صحرا، چاند سورج تارے اور دیگر مظاہر قدرت کو موضوع شاعری قرار دینا اور ان پر بھی کبھی طبع آزمائی کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے مگر مرزا صاحب کا مشن یہ ہے کہ شاعری کی توجہ کی سب سے زیادہ مستحق وہ مخلوق ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ کیا فلسفۂ فطرتِ انسانی کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا کیا ذات انسانی کے جتنے حقایق و معارف ہیں سب قلمبند ہو گئے کہ انہیں چھوڑ کر آم خربوزوں پر نظمیں لکھی جاتی ہیں اور یہ مہملات نہایت جلی حرفوں میں زیب رسائل کیے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم ہندوستانیوں پر تقلید کا وہ جن سوار ہے کہ نیک و بد کی تمیز باقی نہیں رہی۔

شاعری کے متعلق تو مرزا صاحب کا مطمحِ نظر یہ ہے جو مختصر لفظوں میں بیان کیا گیا۔ طبقہ شعراء کی اصلاح کے متعلق مرزا صاحب کا مشن یہ ہے کہ شعراء کو (Mental Slavery) زنجیرِ تقلید سے بالکل آزاد رہنا چاہئے۔ لکھنؤ و دہلی کی تقلید میں پھنس کر بجیترے مونہار افراد کی دماغی استعداد کی صحیح نشو و نما نہ ہو سکی خصوصاً لکھنؤ والوں نے جہاں کسی میں دماغی استعداد کے آثار دیکھے اُسے فنا کر دینے پر تل گئے ایسی افسوسناک حالت میں شعرائے بیرونجات کو چاہئے کہ وہ لکھنؤ اور دہلی کی غلامی سے آزاد ہو کر خود اپنی دماغی استعداد کو ترقی دیں اور آپ اپنی قدر کریں۔ اس سے مرزا صاحب کا منشا یہ نہیں ہے کہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کا جو سرمایہ ہے اُس سے بالکل قطع نظر کر لی جائے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ مقصد ہے کہ لکھنؤ اور دہلی کا سرمایہ سختی اور زبردستی کے ساتھ فاتحانہ قبضہ کیا جائے غلامانہ و گدایانہ طرز سے لکھنؤ اور دہلی کا دست نگر نہ رہنا چاہیے۔ یہی مشن یہی معیار حریت یہی فاتحانہ اسپرٹ ہے جس نے لکھنؤ والوں اور اُن کے سگوں سوتیلوں کو مرزا صاحب کے خلاف بغاوت و شرارت پر آمادہ کیا۔ یہ بغض و عناد محض اس جرم پر تھا کہ مرزا صاحب لکھنؤ والوں کی شاعری کو اس قدر ہیچ و پوچ کیوں سمجھتے ہیں اُن کے کرتوت کا پردہ کیوں فاش کرتے ہیں۔ لکھنؤ والوں کے کلام پر ایسے دندان شکن اعتراضات کیوں کیے۔ جن کا جواب کچھ بن نہیں پڑتا۔ دیکھو

مردانگی و غیرت اسے کہتے ہیں۔

ایہا الحاسدین یاد رکھو کہ ان ہتھکنڈوں سے کوئی کسی بھلے آدمی کو صحیح معنی میں ذلیل نہیں کر سکتا۔ مرزا یاسؔ کی یہ فلاسفی بھی یاد رکھنے اور دستوار العمل بنانے کے قابل ہے کہ انسان ذلیل ہوتا ہے تو محض اپنی کرتوت سے۔ دوسروں کی گستاخیوں بیہودگیوں سے ذلیل نہیں ہو سکتا۔ مولائے مرتضیٰ اور حضرت سید الشہداء نے اپنی فرض شناسی و حریت پسندی کی بدولت کیا کیا سختیاں برداشت کیں سب و شتم گوارا کیے بادی النظر میں لوگ اُسے ذلت سے تعبیر کریں گے (خاکم بدہن) مگر لاحول ولا قوۃ، ذلت تو جب ہوتی کہ وہ خود اپنے جادۂ صواب سے ہٹ جاتے۔

دشمنوں نے مرزا غالبؔ ایسے اکملِ روزگار کے خلاف کلکتہ میں کیا کیا شورشیں اُٹھائیں جن سے تنگ آ کر مرزا غالب ایسے شخص کو مثنوی بادِ مخالف میں معافی مانگنی پڑی۔ باشندگانِ کلکتہ کو آئینِ خلق و مسافر نوازی کی تلقین کرنی پڑی اپنی عاجزی و درماندگی کا دُکھڑا رونا پڑا۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ کیا مرزا یاسؔ کے دل میں بھی لکھنؤ والوں سے صلح جوئی کا خیال کبھی پیدا ہوا لا واللہ ہرگز نہیں۔ مرزا یاسؔ نے کبھی اہلِ لکھنؤ کی طرف سے شریفانہ برتاؤ کی امید کو دل میں جگہ دی ہی نہیں۔ مرزا صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ لکھنؤ کی طرف سے خطا کے سوا وفا کی امید ایک خیالِ خام ہے۔

یاسؔ امیدِ وفا از لکھنؤ فکرِ محال

شیوہ ہائے نامسلمانان برنتابد بہر دے

کلکتہ میں غالبؔ کے خلاف جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ خود اُن کے ہموطنوں نے دہلی کے کوتوال کو بھڑکا کر اور قمار بازی کی تہمت رکھ کر اس یگانۂ روزگار کو جیل خانہ میں پہنچا دیا۔ مرزا یاسؔ کو بھی بعض اہلِ لکھنؤ نے جیل خانے بھجوانے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر پورا نہ ہوا۔ البتہ مرزا

صاحب کی روزی پر حملہ کر کے کامیاب ضرور ہوئے۔ بے غیرتوں نے غالبؔ مغفور کے نام گمنام خطوط میں مغلظ گالیاں لکھ بھیجیں۔ جس پر مرزا غالب نے ہنس کر فرمایا کہ بدتمیزوں کو گالیاں تک دینے کا سلیقہ نہیں۔ لڑکوں کو ماں کی گالی دیتے ہیں وہ اس وجہ سے کہ لڑکوں کو ماں سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ جوانوں کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اُنہیں بیوی سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ بڈھوں کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں اس لئے کہ انہیں بیٹی بہت عزیز ہوتی ہے مگر کم بختوں نے اس بڈھے کو ماں کی گالی کیا سمجھ کر دی جس کی ہڈیاں تک خاک ہو چکی ہوں گی۔ کیا ان شرمناک حرکتوں سے غالبؔ کی آبرو میں فرق آ گیا۔ استغفر اللہ۔ انسان ذلیل ہوتا ہے تو محض اپنے کرتوت سے دوسروں کی بیہودگیوں سے صحیح معنی میں ذلیل نہیں ہوسکتا۔ میاں لکھنوی کے ایک شاگرد غالباً...... ملیح آبادی نے یا اور کسی نے مرزا یاسؔ کے بعض اشعار پر نہایت غلیظ اور ناپاک مصرعے لگائے جن میں مرزا صاحب کے والدین کی شان میں وہی گستاخیاں کی گئی تھیں جو مرزا غالبؔ کی شان میں ہوئی تھیں[1]۔ میاں ذلیل لکھنوی کا عصا بردار مرزا پور کا ایک گنوار اُن ناپاک مصرعوں کو لکھنؤ بھر میں سناتا پھرا۔ لکھنؤ والوں کی خوشنودی اور اپنی ہردلعزیزی کی سند حاصل کرنے کی امید موہوم میں خود اپنا نامۂ اعمال سیاہ کر لیا مگر ان حرکتوں سے مرزا یاسؔ کے مرتبہ میں کیا فرق آ گیا۔ اُن کا اعتبار یوماً فیوماً بڑھتا ہی گیا۔

اخواں کی عداوت سے ہوا شہرۂ یوسف
کچھ پیش نہیں جاتی ہے قسمت کے دھنی سے
آتشؔ

---

[1] وہ مصرعے ایسے گندے اور ناپاک ہیں کہ نقل کرتے ہوئے دل کانپتا ہے جن حضرات کو مرزا یاسؔ کی ہجو سننے کا شوق ہو وہ مذکورہ بالا مصرعے جناب ذلیل وحقی لکھنوی سے طلب کریں۔ ان کے پاس محفوظ ہوں گے۔

ان غلط مصرعوں کی تصنیف کے متعلق صحت کے ساتھ نہیں جا سکتا کہ یہ فعل ملیح آبادی کا تھا یا اور کسی کا۔ مگر لکھنؤ میں ایک کمرہ پر سائل دہلوی کی زبان سے اچانک ایک ایسا لفظ نکل گیا تھا جس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ حرکت ملیح آبادی کی تھی بہر حال یہ حرکت کسی لکھنؤی کی ہو یا لکھنؤیوں کے کسی خوشامدی کی ہو لکھنؤ کے لئے قابلِ فخر ضرور ہے۔ آفرین وصد آفرین مرزا یاس کو کہ ان مغلظات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حاسدوں کے پاس اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ان حرکتوں نے لکھنؤ کے اعمالنامے کو اتنا سیاہ کر رکھا ہے کہ دھوئے نہ مٹے گا دنیا ہمیشہ ان حرکتوں پر لکھنؤ کو بُری طرح یاد کرے گی اور لکھنؤ کو سننا پڑے گا۔ افسوس ہے کہ ان بداعمالیوں کی بدولت خود لکھنؤ نے دنیا کو یہ حق دیدیا کہ اسے بُرا کہے۔

۱۹۱۴ء میں مرزا صاحب نے اپنی غزلیات کا ایک مجموعہ شائع کیا جس پر لکھنؤ کے معتبر اساتذۂ عصر مثلاً حضرت اوجؔ، عارفؔ، رشیدؔ وغیرہم نے ازراہِ قدر شناسی و اعتراف کمال معقول الفاظ میں تقریظیں لکھی تھیں یہ تقریظیں دیکھ کر ویسل، ختمی اینڈ کمپنی انگاروں پر لوٹنے لگے۔ حضرت اوجؔ، عارفؔ، رشیدؔ وغیرہم پر سب وشتم ہونے لگے۔ رسالہ معیار میں (جو ویسل ختم کمپنی کا آلہ تھا) ان بزرگواروں کی شان میں گستاخانہ آوازے کسے گئے اور یہ واویلا مچائی گئی کہ اساتذۂ لکھنؤ نے ایک عظیم آبادی کو مسلم الثبوت صاحب فن مان کر لکھنؤ والوں کی ناک کاٹ لی اور تو اور منشی احمد علی شوقؔ قدوائی کو بھی لکھنؤیوں کی ناک کٹ جانے کی ایذا محسوس ہوئی انہوں نے بھی حضرت یاسؔ کے خلاف رسالہ معیار میں جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لئے غیرت ہو تو آئی ہو وقت گزر جاتا ہے بات رہ جاتی ہے۔ کیسے کیسے لوگوں نے یاسؔ عظیم آبادی پر بقدر حوصلہ وار کئے مگر خداداد قابلیت کسی کے مٹائے نہ مٹی۔ کوئی ان حاسدوں سے پوچھے کہ حضرت اوجؔ وغیرہ نے جو مختصر تقریظیں لکھی تھیں وہ آج مرزا صاحب کے فضل وکمال کے سامنے کیا وقعت رکھتی ہیں۔ اُن تقریظوں سے مرزا صاحب

کے مرتبہ میں کیا اضافہ ہو گیا وہ تقریظیں تو فقط لکھنؤ والوں کے جلانے تپانے کے لیے لکھوائی گئی تھیں یاسؔ اُن تقریظوں سے یاسؔ نہیں ہوئے بلکہ اپنے زورِ قلم سے آج ملک میں مرزا صاحب کو جو مرتبہ حاصل ہے کیا وہ ان تقریظوں کی بدولت ہے؟ وہ تقریظیں تو فقط لکھنؤ والوں کے سوا پبلک کے ذہن میں محفوظ نہ ہوں گی یہ یاسؔ کا زورِ قلم ہے جس نے لوہا منوا لیا۔

اس زمانہ میں جب نشترِ یاسؔ پر اساتذہ لکھنؤ کی تقریظوں نے حاسدوں کے دلوں میں آگ لگا رکھی تھی جناب شفقؔ لکھنوی کے مشاعرہ میں جناب حقیؔ لکھنوی کے برادر عزیز نے مرزا صاحب کی ہجو اُن کے سامنے پڑھی حاضرینِ صحبت نے (جن میں مشاہیر شعراء اور وساء لکھنؤ شامل تھے)۔ نہایت ٹھنڈے دل سے مرزا صاحب کی ہجو سنی اور چھوٹی کے ہاجی صاحب کو دل کھول کر داد دی[1]۔ کسی بھلے آدمی کی زبان سے یہ نکلا کہ ارے او بیوقوف لکھنؤ کی شرافت و تہذیب کو کیوں بدنام کرتا ہے لکھنؤ کی بزرگداشت کو کیوں خاک میں ملاتا ہے۔ آگے چل کر صفحاتِ تاریخ میں یہ نازیبا طرزِ عمل لکھنؤ کو نشانہ صد ہزار نفرین و ملامت بنا دے گا۔ مگر یہ خیال ان ناعاقبت اندیشوں کو کیوں آتا۔ وہاں تو یہ نشہ تھا کہ ہم سب اپنے شہر میں بیٹھے ہیں ہمارا اتنا بڑا جتھا اتنا بڑا گروہ ہے۔ بیچارے یاسؔ غریب الوطن تنِ تنہا ہمارا کیا بنا لیں گے۔ پڑھنے والے نے خوب کڑک کڑک کے ہجو پڑھی سننے نہ تو کیا کرتے۔ بعد مشاعرہ ہاجی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کمال یہ کیا کہ جب سے اب تک ہجو کا جواب ہجو سے

---

[1] یہ ہجو تو مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی ایک اور ہجو چھپوا کر چوک میں تقسیم کی گئی تھی۔ جسے مرزا صاحب نے چراغِ سخن میں نقل کیا ہے اس کے بعض اشعار یہ ہیں:۔

بنام خداوند بالا و پست | کنم یاسؔ را نیست ہر جا کہ ہست
بہ قرآن کہ خواندیم لاتقنطوا | تفو بر رخ یاسؔ ایک تفو
دل کافراں ہمچو دوزخ بود | ز دوزخ بچے یاسؔ مطبخ بود

ماشاء اللہ جناب حقیؔ فارسی بھی خود کہتے ہیں۔ فردوسی ونظامی یاد آ گئے ۱۲۔

نہ دیا۔ ماں باپ کی شان میں گندے الفاظ سُنے مگر سکوت کیا۔ اپنی زبان کو آلودۂ دشنام نہ کیا۔ اور کچھ کہا بھی تو یہ کہا۔

یاسؔ امیدِ وفا از لکھنؤ فکرِ محال　　شیوہ ہائے نا مسلماں بر نتابد ہر دلے

مزار یاسؔ پہ کرتے ہیں شکر کے سجدے　　دعائے خیر تو کیا اہلِ لکھنؤ کرتے

افسوس ہے کہ وہ غلیظ مصرعے مرزا صاحب اور اُن کے والدین کی شان میں کہے گئے ہیں نقل نہیں کئے جاسکتے ورنہ پبلک کو لکھنؤ والوں کی تہذیب و متانت کا اندازہ ہو جاتا۔ پبلک ذرا انصاف سے دیکھے۔ اگر یہ ہجو گوئی شخصِ واحد کا فعل ہوتا تو اس کی ذمہ داری بھی ایک ہی شخص پر ہوتی۔ مگر جب تمام حاضرینِ محفل نے جن میں مشاہیر شعراء اور وسائے لکھنؤ شامل تھے ٹھنڈے دل سے اس ہجو کو پاس کر دیا اور دل کھول کر داد دی بلکہ اسے اپنے حسد شعاروں کا پھایا بنایا کسی متنفس کی زبان سے اس ہجو کے خلاف کلمہ برأت نہ نکلا۔ اور کسی کا کیا ذکر خود صاحب مشاعرہ (جن کے بلائے ہوئے مہمان یاسؔ صاحب بھی تھے) اور صاحب مشاعرہ کے استاد جی میاں آرزوؔ لکھنوی نے بھی خاموشی ہی اختیار کی اور اپنے ہموطن ہاجی صاحب کو اس ناشائستہ حرکت سے باز نہ رکھا چھوٹے منہ سے نہ نکلا کہ ہمارے مشاعرہ میں آپ کو کسی مہمان کی ہجو پڑھنے کا حق نہیں ہے[1] تو یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ ہاجی

[1] آرزوؔ لکھنوی کی اس بزدلی و بےغیرتی کی کوئی حد ہے کہ اپنے مشاعرہ میں ایک غریب الوطن مہمان کی دل آزاری و توہین اپنے ہموطنوں کی خاطر خاموشی سے گوارا کرلی۔ یہ دل آزاری اسوقت روا رکھی گئی تھی جب یاسؔ و آرزوؔ میں پینگ بڑھے ہوئے تھے اُس وقت تک آرزوؔ کو یاسؔ کی دوستی و بہی خواہی کا دعویٰ تھا کیا اس شرمناک واقعہ سے آرزوؔ کی اخلاقی کمزوری بزدلی اور بے غیرتی کا ثبوت نہیں ملتا؟ ارے میاں اسی بزدلی و بے غیرتی کا فیض تھا کہ واجد علی شاہ لکھنؤ سے ٹھنڈے ٹھنڈے مٹیا برج کو سدھارے اور لکھنؤ والوں کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔

صاحب (برادر جناب خفی لکھنوی) کی حرکت کی ذمہ داری علی العموم اہل لکھنؤ پر ہے جب سے اب تک اہل لکھنؤ کی جانب سے اس نازیبا حرکت پر پبلک میں اظہارِ افسوس وندامت نہیں کیا گیا اور کیوں کیا جاتا لکھنؤ والوں کو تو فطری حق حاصل ہے کہ وہ بیرونیوں کو گالیاں دیں ہجویں کریں مضحکے اُڑائیں۔ بیرونی تو اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ ان ناشائستہ حرکتوں پر بھی لکھنؤ والوں کے آگے سر جھکائے رہیں اُف نہ کریں۔ اگر کسی نے کچھ جواب دیا یا اعتراض کیا تو سرکش کہلایا۔ کشتنی گردن زدنی ٹھہرا۔ بائیکاٹ یا شہر بدر کردینے کے قابل سمجھا گیا مگر لکھنؤ والو یاد رکھو کہ تمہاری یہ فرعونیت یہ خدائی اب نہیں چل سکتی۔ وہ دن لد گئے۔ اب اینٹ کی لینی پتھر کی دینی کا زمانہ ہے۔ آگ کھاؤ گے تو انگارے......

کیا اس ملی بھگت پر بھی اجماعی حیثیت سے اہلِ لکھنؤ ان شرمناک جرائم سے بری ہوسکتے ہیں۔ اہلِ لکھنؤ نے جب مرزا صاحب کا بائیکاٹ ٹھنڈے دل سے گوارا کرلیا اُن کی ہجویں شوق سے سنیں تو کیا اب بھی لکھنؤ تعمیم کے ساتھ نفرین وملامت کا مستحق نہیں ہے۔ اگر لکھنؤ والوں کی ان حرکتوں پر مرزا صاحب اور ساری دنیا لکھنؤ کو تعمیم کے ساتھ برا کہے تو کون سی شکایت کی بات ہے۔ بعض سنجیدہ حضراتِ لکھنؤ کو مرزا صاحب سے شکایت ہے کہ لکھنؤ تعمیم کے ساتھ قابلِ نفرین کیوں نہ ہوتا۔ لکھنؤ نے تو خود اپنی مذمت کا حق دنیا کو دے رکھا ہے۔ پہلے تو کچھ نہ سوچا اب لکھنؤ کے خلاف تلخ و ناگوار الفاظ سُن کر تکلیف ہوتی ہے۔ اب لکھنؤ کے سنجیدہ افراد کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ لکھنؤ کے خلاف جو کچھ کہا جائے اُسے برداشت کریں کیونکہ خود اُن کے ہموطنوں نے لکھنؤ کو مستحقِ ملامت بنادیا ہے۔ اپنا سونا کھوٹا تو پرکھنے والے کو کیا دوش۔ از ماست کہ بر ماست لکھنؤ کے علما و روساء بھی جب اس ناگوار صورت حال کا دور سے تماشا دیکھتے رہے اور اپنے اخلاقی فرض کی طرف سے چشم پوشی کی اپنے ہموطنوں کو راہِ راست پر لانے سے پہلوتہی کی اپنے قومی اور اخلاقی فرض کو کچھ نہ سمجھے اور ایک غریب الوطن مہمان پر یہ سب ظلم وستم دیکھتے رہے تو اب اُن کا دوسرا فرض یہ

ہے کہ لکھنؤ کے خلاف جتنے سخت و سست الفاظ کہے جائیں انہیں شربت کے گھونٹ کی طرح پی جائیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ علمائے لکھنؤ کی جوتیوں کو کیا غرض پڑی تھی کہ مرزا یاس کے معاملہ پر توجہ کرتے۔ مگر فرض شناس ضمیر یہی گواہی دے گا کہ افرادِ قوم میں ایسے ناگوار نفاق ایسی شرمناک جنگ کا دور سے تماشا دیکھتے رہنا اور اصلاحِ حال کی طرف ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا سخت اخلاقی جرم ہے۔ ذرا غور تو کرو اگر تمہارا امام تمہارا پیشوا اس وقت موجود ہوتا تو کیا اس شرمناک منافقانہ کشمکش کو دور سے دیکھتا رہتا اصلاحِ حال کی طرف توجہ نہ کرتا۔ کیا علماء پر جو نائب امام ہیں اصلاحِ قومی کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی کیا سوسائٹی کی اصلاح علما ورؤساء کا اخلاقی فرض نہیں ہے۔

من آنچہ شرطِ بلاغ است باتو میگویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ چوک میں مرزا صاحب سے انتقام لینے کے لئے ڈنڈا لئے پھرنا۔ مرزا صاحب کی آبروریزی کے لئے ایک شخص کو کلکتہ سے بلوانا اور آمادۂ انتقام کرنا مشاعرہ میں مرزا صاحب کی ہجو پڑھنا اور چھپوا کر چوک میں تقسیم کرنا۔ مرزا صاحب کے والدین یعنی مردوں کی شان میں گندے اور ناپاک اشعار کہہ کر تشہیر کرنا اور لکھنؤ کی تہذیب و شرافت کو خاک میں ملانا، لکھنؤ، الہ آباد، بنارس کے مشاعروں میں مرزا صاحب کا بائیکاٹ کر کے بزدلی کا ثبوت دینا۔ اور آخر میں مرزا صاحب کی روزی پر حملہ کر کے اپنی طاقت دکھانا لکھنؤ والوں کے ایسے کارنامہائے فتح ہیں جو صفحاتِ تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ اس فتح پر لکھنؤ جہاں تک ناز کرے بجا ہے۔ مگر ہم پبلک سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ایسی سختیوں ایسی دل آزاریوں پر بھی اپنی آن بان قائم رکھنا اپنے مشن سے غافل نہ رہنا کوئی آسان کام ہے۔ جس کی پرائیویٹ زندگی کی تلخیاں ناگفتہ بہ حالت کو پہنچ گئی ہوں اور جس کا ماحول اس قدر خطرناک ہو اُس کی خود پرستی کی فلاسفی اور فرض شناسی کی داد تو کیا دی

جاتی اُلٹا الزام رکھا جاتا ہے۔ قدر روانی عالمِ بالا معلوم شد۔ جنگی زندگی بسم اللہ کے گنبد میں گزرتی ہے وہ کیا جانیں اخوان الشیاطین سے سامنا ہو تو حقیقت کھلجائے۔ لکھنؤ میں رواداری کی سیر تو دلچسپ ہوتی ہے مگر وہاں رہ کر آزادانہ زندگی بسر کرنا لکھنؤیوں کے حملے روکنا اور جھنڈے گاڑ دینا ہر کس و ناکس کا کام نہیں بڑے بڑے بوکھلا جاتے ہیں۔ آج تک کسی بیرونی پر نہ ایسے سخت حملے ہوئے نہ کسی بیرونی نے ایسی دلیرانہ مدافعت کرکے میدان مارا۔ یہ سہرا مرزا یاس یگانہ کے سر رہا ہے اور رہے گا۔ والسلام

میرزا امراد بیگ شیرازی

یاس یگانہ چنگیزی کاکول میں

محسن احسان

میں اگست ۱۹۵۱ء میں محکمہ خزانہ کی ملازمت کے سلسلے میں ایبٹ آباد چلا گیا۔ وہاں اس وقت شوکت واسطی، کریم اللہ خان درانی (جو بعد میں جسٹس کریم اللہ درانی ہوئے) عارف بٹالوی، سید واجد رضوی، انور شبنم دل، اور کسی دوسرے اہلِ علم و ادب جمع تھے بزمِ علم و فن کی بنیاد رکھی جا چکی تھی اس کے صدر مرحوم سیشن جج یوسف حیات تھے اور نائب صدر ممتاز وکیل سجاد احمد جان (والد وسیم سجاد) تھے بزم کی علمی ادبی تقریبات ہر مہینے اربابِ ثروت و حیثیت کے گھر منعقد ہوتی اور وہاں اہلِ علم مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے اور دل و دماغ کے دریچے وا ہوتے۔ یہ اہلِ علم کا ایک دلکش اجتماع ہوتا اور بعض نوجوان بشمول راقم الحروف اس میں شرکت کرتے۔ شوکت واسطی جو ان دنوں گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں تاریخ کے لیکچرار تھے اس بزم کے روحِ رواں تھے۔ وہ اس وقت بھی اور اب بھی اس قسم کے ادبی جلسے اور کل پاکستان مشاعرے منعقد کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔

پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول جو ایبٹ آباد سے تقریباً سات میل کے فاصلے پر واقع تھی اس میں فیکلٹی آف سائنس میں کئی نامور اہلِ علم درس و تدریس سے متعلق تھے جو نوجوان کیڈٹس کو جدید علوم و فنون کی تدریس میں سرگرمِ عمل تھے۔ ایبٹ آباد گورنمنٹ کالج کی وجہ سے علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ طلبہ کی چھوٹی چھوٹی ادبی محفلیں سیر و سیاحت کے پروگرام مطالعاتی دورے بین الکلیاتی مباحثے اور مشاعرے منعقد ہوتے اس کالج میں اُن دنوں دلی کے آخری مشاعرے کے انداز کا اجتماع شعراء ترتیب دیا گیا۔ جس میں اساتذہ اور طلبہ نے

مختلف مرحومین کے روپ دھار کر مشاعرے میں شرکت کی۔ یہ بہت کامیاب "عرشی مشاعرہ" تھا۔ کہ طلبہ کی اس کاوش سے ہمارے متقدمین کو ان کے لباس میں دیکھنے ان کی جملہ بازی اور معاصرانہ چپقلش سے محظوظ ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ شوکت واسطی کی طلبہ میں ہردل عزیزی کی وجہ سے بعض رفیقانِ کار دشمنی پر اُتر آئے۔ اور ٹانگ کھینچنا شروع کردی۔ لیکن یہ ہٹ کے پکے نکلے ادبی جلسے اور مجلس منعقد کرتے رہے۔ اور اکثر نوجوان لکھنے والے ان میں شامل ہوتے رہے۔ کاکول میں کرنل محمد اسحاق، کرنل عبدالحیٔ، میجر آفتاب حسن، کرنل یوسف عباسی، پروفیسر افضال قادری، ڈاکٹر مظہر علی خان، زائر رضوی اور کئی دوسرے اہلِ علم جمع تھے۔

نومبر ۱۹۵۱ء کی ایک صبح یوسف حیات نے شوکت واسطی اور مجھے مطلع کیا کہ کاکول میں ڈاکٹر مظہر علی خان کے ہاں ایک ادبی نشست ہے اور اس میں ہم دونوں کو شرکت کی دعوت ہے۔ لے جانے اور لانے کا بندوبست انوری صاحب کے ذمے ہے جو اس وقت محکمہ جنگلات ہزارہ کے کنزرویٹو تھے۔ ایبٹ آباد میں جن چند لوگوں کے پاس موٹریں تھیں انوری صاحب اُن میں سے ایک تھے۔ سو شام ہوئی اور ہم سات بجے کے لگ بھگ کاکول کے لیے روانہ ہوئے ایبٹ آباد، کاکول سڑک پر سناٹا طاری تھا اور یوں بھی سردی کا زمانہ تھا اس لیے کہیں بھی دور تک آدم زاد کا کوئی نشان نہیں پایا گیا۔ گاڑی میں انوری صاحب نے بتایا کہ یاسؔ یگانہ کاکول مظہر علی خان کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور یہ تقریب انہی کے اعزاز میں ہے۔ میں دل میں بہت خوش تھا کہ آج غالبؔ کے حریف کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ سو ہم لوگ کاکول پہنچ گئے میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر مظہر علی خان کو دیکھا سانولا رنگ دل خوش کن اندازِ گفتگو، چہرے پر عینک، گھر سلیقے اور قرینے سے آراستہ، ہم ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے تو فرش پر چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ اور کچھ احباب آپس میں محوِ گفتگو تھے ہم سب ایک طرف بیٹھ گئے۔ میں اس نشست میں

سب سے کم عمر تھا۔ سو دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تقریباً دس منٹ کے بعد مظہر علی خان صاحب آئے اور کہنے لگے "سرکار تشریف لا رہے ہیں سرکار تشریف لا رہے ہیں" اور ان کے فوراً بعد ایک دبلے پتلے چھوٹے قد وقامت کے آدمی داخل ہوئے سر پر ٹوپی، گلے میں مفلر، اچکن زیب تن، ساری محفل نے کھڑے ہو کر استقبال کیا مہمان نے سب سے مصافحہ کیا اور گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ حال احوال اور خیریت وعافیت دریافت کرنے کے بعد ڈاکٹر مظہر علی نے کہا۔ سرکار، وہ چچا غالب کے ساتھ کیا معاملہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے انداز میں چھیڑ خوانی کا پہلو تھا۔ یہ بات انھوں نے اپنے مخصوص لب ولہجے میں کہی۔ اور یگانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔ حضرت! پرانی باتیں مت چھیڑیے۔ حاضرین ہنس پڑے دو چار باتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا حضرت یہ سب آپ کے مداحین جمع ہیں کچھ ارشاد فرمایئے یگانہ چنگیزی نے پہلو بدلا بیاض اٹھائی تھوڑی دیر گنگناتے رہے اور اس کے بعد انھوں نے ترنم سے غزلیں سُنانا شروع کیں۔ مجھے وہ ساری غزلیں یا ان کے مطلعے یا زمینیں تو اب یاد نہیں البتہ دو تین غزلوں کے مطلعے ابھی تک ذہن پر محفوظ ہیں۔ ایک غزل یہ تھی جو ہم نے ترنم سے سُنی تھی۔

ہنوز زندگیِ تلخ کا مزہ نہ ملا
کمالِ صبر ملا صبر آزما نہ ملا

ایک غزل یہ بھی کہی تھی کہ:

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

اور تیسری غالباً یہ غزل تھی جو حافظے میں بہت مدہم سی محفوظ ہے:

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

دادو تحسین کے ڈونگرے برستے رہے اور یگانہؔ لطف لے لے کر سُناتے رہے۔

اس کے علاوہ یاس یگانہؔ نے اور کئی غزلیں تازہ اور پرانی سُنائیں جواب بالکل یاد نہیں۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ کسی دوسرے شاعر نے وہاں کوئی کلام نہیں پڑھا۔ یہ ساری محفل یگانہؔ کی محفل تھی۔ اور یگانہؔ کے ترنم کی محفل۔ اس محفل کی ایک تصویر بھی موجود ہے جو ڈاکٹر مظہر علی خان کی وفات (یکم جنوری ۱۹۷۱ء) کے موقع پر ایک مجلّہ مرتبہ نصیر ترابی طٰحہ ترابی (جو علامہ رشید ترابی کے صاحبزادگان ہیں اور ڈاکٹر مظہر علی خان کے بھتیجے) نے شائع کیا تھا۔ جس کی ایک کاپی میرے پاس موجود ہے۔ اس میں شائع ہوئی۔ اس تصویر میں ڈاکٹر آفتاب حسن، ڈاکٹر مظہر علی خان، اور چند ایک احباب دکھائی دے رہے ہیں۔ یاس یگانہؔ کے سر پر کالی ٹوپی ہے اور گلے میں مفلر ہاتھ میں بیاض پکڑی ہوئی ہے۔ اور گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ محفل تقریباً اڑھائی تین گھنٹے تک برپا رہی رخصت کے وقت سب نے بہت مؤدبانہ انداز سے یگانہؔ سے ہاتھ ملائے۔ اس محفل کا نشہ کئی دنوں طاری رہا اور اس کی باتیں میں نے کئی محفلوں میں دہرائیں۔

ڈاکٹر مظہر علی خان اکثر و بیشتر ایبٹ آباد میں منعقد محفلوں میں آتے اور اپنے تبحرِ علمی سے حاضرین کے دل و دماغ کو منور کرتے۔ وہ انگریزی فارسی اور اُردو کے بڑے عالم تھے انگریزی کے مابعد الطبیعاتی شعراء کے بھی وہ مولانا روم اور میر انیس کے بے حد شیدائی، سینکڑوں اشعار انہیں یاد تھے۔ اور اکثر انیس و شیکسپیئر کے کلام کا موازنہ کرتے تھے۔ جب یگانہؔ کاکول کے قیام کے بعد واپس ہندوستان جانے لگے تو لاہور پہنچ کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ کراچی جانے کے بجائے لاہور ہی سے بھارت چلے جائیں۔ ان کے پاس صرف کراچی کے قیام کا پرمٹ تھا۔ سو وہ بارڈر پر پہنچے تو دھر لیے گئے۔ اور جیل پہنچا دیے گئے کہ بغیر اجازت کے لاہور کیسے آ گئے۔ غالباً دو تین ہفتے جیل میں رہے جب مجسٹریٹ کے سامنے پیشی ہوئی تو پوچھا کہ تم کون ہو بولے یگانہؔ۔ مجسٹریٹ آفتاب احمد تھے انھوں نے کہا کہ پورا

نام کیا ہے۔ انھوں نے کہا یاس یگانہ مجسٹریٹ نے پھر کہا وہ تو ہندوستان میں ایک ہی ہے یاس یگانہ چنگیزی...... انھوں نے جواب دیا حضور میں ہی ہوں۔ آفتاب صاحب نے تا برخاستِ عدالت قید کا حکم سُنایا اور پھر عدالت برخاست کردی گئی۔ اور آفتاب صاحب یگانہ کو اپنے گھر لے آئے اور بھارت کے لیے رُخصت کیا۔

یگانہ چنگیزی نے جیل سے ایک پوسٹ کارڈ ڈاکٹر مظہر علی خان کو کاکول کے پتے پر ارسال کیا تھا۔ جو مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اور جس میں صرف یہ تحریر تھا کہ حضرت کاکول سے نکلا تو جیل پہنچ گیا۔ یہاں ۲۱ دن قیام کیا آفتاب صاحب کی مہربانی سے اب اپنے وطن جا رہا ہوں۔ فقط یگانہ۔

ڈاکٹر مظہر علی خان نے بعد میں تفتیش کی تو سارے واقعہ کا پتہ چلا اور یہ بھی معلوم ہوا (جو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بتایا) کہ جیل کے حکام نے کہا کہ قیدیوں کے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھا کرو۔ جس پر یگانہ نے انکار کردیا تو حکم ہوا کہ نماز نہیں پڑھتے تو قیدیوں کے کوزے بھرا کرو۔ اور یگانہ اکیس روز تک قیدیوں کے وضو کے لیے کوزے بھرتے رہے۔

maablib.org

کچھ وقت ''کلیاتِ یگانہ'' کے ساتھ

غالب شکن یگانہ کا نام میرزا واجد حسین تھا۔ ان کی شخصیت میں تعمیر کے جو پہلو تھے وہ خدا جانے کیوں دب گئے لیکن تخریب کے زاویے ابھرتے چلے گئے، جب ''یاس'' کے تخلص سے موسوم تھے تو ان کے چنگیزی اوصاف دُور سے پہچانے جاتے تھے۔ لیکن جب یگانہ چنگیزی ان کے باطن سے رونما ہوا تو اس میں ''یاس'' کا کوئی عنصر نظر نہ آتا تھا حالانکہ اس وقت وہ خود مجسمہ یاس بنے ہوئے تھے۔ ان کے سر پر خودی کا نشہ چڑھا ہوا تھا اور انھیں آپے سے باہر ہوتے بھی دیر نہ لگتی تھی لیکن یہ اعتراض بھی کرتے تھے کہ:

''خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا''

میں نے یگانہ کا نام اپنی چھٹی جماعت میں اُردو کے استاد مولوی محمد بخش کی زبان سے سنا تھا، انھوں نے یگانہ کا مُندرجہ ذیل شعر پہلے ہمیں املا کرایا اور پھر اس کی لفظی تصحیح تختۂ سیاہ پر لکھ کر کی۔

پہنا دیا ہے طوقِ غلامی تو...... ایک دن
میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا

مولوی محمد بخش (جو آج کے نامور غزل نگار خالد اقبال یاسر کے نانا تھے) اس شعر کا دوسرا مصرع پڑھتے، ایک آہ بھرتے اور کہتے یہ دعائیہ شعر یگانہ لکھنوی کا ہے۔ انھوں نے ہمیں اسی شعر کے حوالے سے ''آزادی'' کا مفہوم انگریزوں کی غلامی کے دور میں ۱۹۳۹ء میں سمجھانے کی کوشش کی جب قرار دادِ لاہور ابھی پیش نہیں ہوئی تھی۔ یگانہ کا زیادہ ذکر مولوی پیر بخش صاحب بھی کرتے تھے جو آٹھویں جماعت میں گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان میں ہمیں اُردو پڑھاتے تھے اس وقت یگانہ کی غالب شکنی کو شہرت مل چکی تھی اور جو شخص بھی

سنتا تھا، یگانہ سے ناراضی کا اظہار کیے بغیر نہ رہتا اور کہتا:

"کہاں غالب، کہاں یگانہ"

بعد میں جب اُردو ادب کا ذوق بڑھتا گیا تو میرے دل میں یگانہ کی غالب شکنی کے علی الرغم ان کی اپنی غیر معمولی ادبی شخصیت کا نقش مستحکم ہوتا چلا گیا، اور "یگانہ آرٹ" کے نقوش بھی نکھرتے چلے گئے جس میں ایک شوخ رنگ ان کی نثر نے بھی بھرا تھا۔ مجھے سید وقار عظیم کے دورِ ادارت میں رسالہ "آج کل"، دہلی میں ان کا مضمون "ادب خبیث" یاد ہے جو ۱۹۴۳ء کے اوائل میں چھپتے ہی موضوعِ بحث بن گیا تھا۔ اس مضمون میں بھی انھوں نے دوسروں کو بزورِ قلم رَد کرنے کی اور خود کو بزورِ فن منوانے کی پوری کوشش کی تھی اور یہ بھی نظر آتا تھا کہ وہ خودی کے نشے میں سرشار ایک ایسے تنہا شخص ہیں جو پورے زمانے سے پنجہ آزمائی کر رہے ہیں، یگانہ کو ان کے عہد نے تسلیم کیا تھا، حتیٰ کہ علامہ اقبال بھی ان کے قدر دانوں میں شامل تھے اور ان کی زبان دانی کا اعتراف کرتے تھے۔ مشفق خواجہ صاحب نے انکشاف کیا ہے کہ:

"ایک مرتبہ زبان کے معاملے میں کسی نے رہنمائی چاہی تو اقبال نے جواب میں یاسؔ اور عزیزؔ لکھنوی کے پتے لکھے اور کہا کہ ان سے رہنمائی حاصل کی جائے"

یگانہ کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایئے کہ یگانہ کی غزلیں اس وقت نصاب میں شامل کر لی گئی تھیں، جب اس دور کے متعدد شعرا اس اعزاز سے محروم تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور کے اُردو اساتذہ کے لیے حالی، اکبر اور داغ کا پڑھانا آسان تھا، یگانہ کی تفہیم و تشریح مشکل تھی اور طلبہ کو یگانہ کے باطن میں اترنے کے لیے خود اپنے ذوق پر انحصار کرنا پڑتا تھا چنانچہ میں کہہ سکتا ہوں کہ یگانہ سے جو لگاؤ بچپن میں پیدا ہوا وہ زندگی بھر قائم رہا اور اب "کلیاتِ یگانہ" چھپ کر آئی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جیسویں

صدی کو کامیابی سے سر کرنے کے بعد یگانہ اب اکیسویں صدی میں داخل ہو گئے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں اپنی فتح کا پھریرا ابھی ہے۔

مرزا یاس چنگیز یگانہ چنگیزی ۱۸۸۴ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد ۱۹۰۴ء میں کلکتہ میں نواب واجد علی شاہ کے خاندان کے دو افراد کی معلمی کی اور پھر لکھنؤ آ گئے۔ عزیز لکھنوی نے رسالہ ''معیار'' جاری کیا تو یگانہ غالب کی زمینوں میں غزلیں کہنے اور مشاعروں میں پڑھنے لگے۔ یہ معاصرانہ چشمک کا دور تھا جو زندگی بھر قائم رہا۔ ۱۹۱۴ء میں ''نشترِ یاس'' شائع ہوئی۔ اودھ اخبار کے علاوہ کچھ دنوں ریلوے میں ملازمت کی۔ اٹاوہ میں معلمی کی۔ ۱۹۲۶ء میں عطر چند کپور کے ادارہ ''اُردو مرکز لاہور'' سے وابستہ ہو گئے۔ عبدالطیف تپش، محمد دین تاثیر، عابد علی عابد، صوفی تبسم اور خواجہ دل محمد سے ان کے خصوصی مراسم تھے لیکن پھر واپس لکھنؤ چلے گئے۔ آزادی کے بعد خاندان کے کچھ افراد کے ساتھ لاہور آ گئے۔ ۱۹۵۱ء کو فوت ہو گئے۔ نشترِ یاس، آیاتِ وجدانی، ترانہ اور گنجینہ، ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔

یگانہ دستبردِ زمانہ کی نذر ہو چکے تھے۔ ان کی خوش قسمتی سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انھیں اپنی وفات کے بہت عرصہ کے بعد مشفق خواجہ جیسا قدرداں میسر آ گیا جنہوں نے یگانہ کو نہ صرف ایک مستقل موضوع کی حیثیت میں اپنا جزوِ حیات بنا لیا بلکہ تحقیقِ یگانہ میں اپنی تمام تحقیقی صلاحتیں صَرف کر دیں اور اپنی بصارت اور بصیرت کے چراغوں سے وہ کرنیں جمع کیں جو آج یگانہ کی زندگی کو نہ صرف منور کر رہی ہیں بلکہ تحقیق کا ایسا مثالی نقش بھی پیش کرتی ہیں جو اپنی نظیر آپ ہے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ اس کتاب کی تکمیل کیے لیے مشفق خواجہ صاحب نے کتنی دیدہ ریزی کی اور اور اپنی زندگی کے ماہ و سال کے علاوہ اپنی صحت بھی اس کتاب کی نذر کر دی۔ اس کتاب کی خوبی صرف یہ نہیں کہ اس میں یگانہ کا تمام مطبوعہ، غیر مطبوعہ، مدوّن اور غیر مدوّن کلام جمع کر دیا گیا ہے بلکہ ہر تخلیق کا زمان و مکان، اشاعت کا ماہ

وسال اور کتاب یا جریدے کا نام بھی دیا گیا ہے۔ جس ادیب سے کتاب کا مواد حاصل کیا ہے، اس کا نام اور پتہ بھی درج ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ متن کی تصحیح کے ساتھ یگانہ کی فرہنگ بھی پیش کردی ہے جو صرف یگانہ سے مخصوص ہے۔ اس طرح صدہا ایسے الفاظ اس کتاب میں ازسرِنو دریافت ہوئے ہیں جو خزینۂ یگانہ میں مدفون تھے۔ خوبی کی بات یہ کہ یگانہ کی سب کتابوں کا پورا متن، خودنوشت حالات، دیباچے اور بعض غزلوں کے قلمی عکس اور بعض سابقہ ایڈیشنوں کے سرورق بھی شامل کیے گئے ہیں۔ مشفق خواجہ صاحب کا معراج کمال اس کتاب کے حواشی میں ظاہر ہوتا ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایسی کتاب ہے جو ایک نظر میں آپ کے قلب ونظر کو مغلوب کرلیتی ہے۔ بلاشبہ یہ ''کلیاتِ یگانہ'' ہے لیکن اب یہ بجا طور پر تالیفِ مشفق خواجہ بھی معروف ہوگی اور آئندہ جو کام بھی یگانہ پر ہوگا اس کا بنیادی مآخذ یہ کتاب ہوگی۔ میرے دوست احمد زین الدین نے درست لکھا ہے کہ ''مشفق خواجہ نے کلیاتِ یگانہ کی ترتیب وتدوین کے اس مشکل ترین اور صبر آزما تحقیقی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر اپنی بقا کا سامان فراہم کردیا اور ہمیں بیگانگی کی ''سحر آسا'' دھند سے نکال کر ''یگانہ آشنا'' بنا دیا۔''

اس کتاب کی اشاعت سے یگانہ شناسی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو مولانا حالی کی ''یادگارِ غالب'' کی اشاعت کے بعد غالب شناسی کا شروع ہوا تھا۔ مشفق خواجہ صاحب نے یگانہ پر سات مزید نایاب کتابوں کی اشاعت کا اعلان کرکے اپنے قارئین کی تشنگی میں اضافہ کردیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مشفق خواجہ ان دنوں علیل ہیں لیکن تحقیق کے کام کو انھوں نے کبھی پسِ پشت نہیں ڈالا۔ وہ اپنی صحت کی قیمت پر بھی اپنے منصوبوں کی تکمیل ضرور کریں گے۔ آیئے ان کی لمبی زندگی اور صحت کے لیے دعا کریں اور مبین مرزا کا بھی شکریہ ادا کریں جنھوں نے اپنی اکادمی بازیافت سے ۹۶۰ صفحات کی یہ گراں قدر کتاب شائع کی۔ اس کتاب کا ہر لائبریری میں ہی نہیں، ہر گھر میں موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ جس گھر میں یہ کتاب ہوگی وہاں یہ صاحب خانہ کے اعلیٰ ادبی ذوق کی دلیل بن جائے گی۔

۱۹۱۴ء

مجموعہ کلام نشترِ یاس سے انتخاب

غزلیات

واں نقاب اٹھی کہ صبحِ حشر کا منظر کھلا
یا کسی کے حسنِ عالم تاب کا دفتر کھلا

غیب سے پچھلے پہر آتی ہے کانوں میں صدا
اٹھو اٹھو رحمتِ ربِ علا کا در کھلا

آنکھ جھپکی تھی تصور بندھ چکا تھا یار کا
چونکتے ہی حسرتِ دیدار کا دفتر کھلا

کوئے جاناں کا سماں آنکھوں کے آگے پھر گیا
صبحِ جنت کا جو اپنے سامنے منظر کھلا

رنگ بدلا پھر ہوا کا مے کشوں کے دن پھرے
پھر چلی بادِ صبا پھر مے کدے کا در کھلا

حسرتِ پرواز میں پر تولتے ہیں یاں اسیر
وہ صبا مستانہ آئی، وہ چمن کا در کھلا

گر پڑے تیورا کے آنکھوں میں اندھیرا آ گیا
واں نقابِ رُخ اٹھی یاں رازِ سرتاسر کھلا

بند آنکھیں ہو گئیں بے تاب ہو ہو کر گرے
سامنے پیاسوں کے کس نے رکھ دیا ساغر کھلا
آرہی ہے صاف بُوئے سنبلِ باغِ جناں
گیسوئے محبوب شاید میری میت پر کھلا
چار دیوارِ عناصر پھاند کر پہنچے کہاں
آج اپنا زورِ وحشت عرشِ اعظم پر کھلا
چپ لگی مجھ کو گناہِ عشق ثابت ہو گیا
رنگ چہرے کا اُڑا رازِ دلِ مضطر کھلا
اشکِ خوں سے زرد چہرے پر ہے کیا طرفہ بہار
دیکھیے رنگِ جنوں کیسا مرے منھ پر کھلا
خنجرِ قاتل سے جنت کی ہوا آنے لگی
اور بہارِ زخم سے فردوس کا منظر کھلا
نیم جاں چھوڑا تری تلوار نے اچھا کیا
ایڑیاں بسمل نے رگڑیں صبر کا جوہر کھلا
صحبتِ واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں
رازِ اپنی مے کشی کا کیا کہیں کیوں کر کھلا
ہاتھ اُلجھا ہے گریباں میں تو گھبراؤ نہ یاسؔ
بیڑیاں کیوں کر کٹیں زنداں کا در کیوں کر کھلا

(۱۹۱۲ء)

جلوۂ قاتل سے کچھ ایسا میں حیراں رہ گیا
اک تڑپنے کا تھا ارماں وہ بھی ارماں رہ گیا
شکر ہے لاشہ مرا مقتل میں عریاں رہ گیا
مرحبا اے عشق، تیرے ہاتھ میداں رہ گیا
رازِ الفت داغ بن کر دل میں پنہاں رہ گیا
آہ تک میں نے نہ کھینچی گھٹ کے ارماں رہ گیا
تجھ سے اے اشکِ ندامت، کیا یہی اُمید تھی
دامنِ دل پر جو اپنے داغِ عصیاں رہ گیا
انتظارِ یار میں آنکھیں کھلی ہیں رات دن
یہ وہی در ہیں کہ جن کو شوقِ مہماں رہ گیا
اہلِ محفل دید کے قابل ہے ناز اُس شوخ کا
دل میں آ بیٹھا مگر آنکھوں سے پنہاں رہ گیا
زندگی بھر تک تو شرمندہ نہ تھے یاروں سے ہم
لاش اٹھانے کا مگر آخر اک احساں رہ گیا
چل رہی تھی سانس اپنی خود چھُری کی طرح سے
تیغِ قاتل کا عبث گردن پہ احساں رہ گیا
مرنے والے جذبِ دل کی نارسائی دیکھ لیں
آنکھ اُٹھا کر وہ سُوئے گورِ غریباں رہ گیا
خاک چھانی عمر بھر کُوئے بتاں میں یاس نے
وائے ناکامی کہ اِس پر بھی مسلماں رہ گیا

(۵۔۳۔۱۹۰۴ء)

اگر اپنی چشمِ نم پر مجھے اختیار ہوتا
تو بھلا یہ رازِ الفت کبھی آشکار ہوتا

ہے تنک مزاج صیاد کچھ اپنا بس نہیں ہے
میں قفس کو لے کے اُڑتا اگر اختیار ہوتا

یہ ذرا سی اِک جھلک نے دل وجاں کو یوں جلایا
تری برقِ حسن سے پھر کوئی کیا دو چار ہوتا

ابھی تو یہ اس گریباں کی بھلا بساط کیا تھی
یہ کہو کہ ہاتھ اُلجھا نہیں تار تار ہوتا

وہ نہ تو آتے فاتحہ کو ذرا مڑ کے دیکھ لیتے
تو ہجومِ یاس اتنا نہ سرِ مزار ہوتا

(۱۹۱۱ء)

فکرِ انجام نہ آغاز کا کچھ ہوش رہا
چار دن تک تو جوانی کا عجب جوش رہا

میں قفس میں بھی کسی روز نہ خاموش رہا
کشمکش میں بھی طبیعت کا وہی جوش رہا

نشۂ الفتِ ساقی کا عجب جوش رہا
ہول صحرائے قیامت بھی فراموش رہا

غیر ہوں جرعہ کشِ بزمِ تمنا افسوس
خون کے گھونٹ میں پیتا رہا، خاموش رہا

"ہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را"

دشتِ غربت میں یہ سوچ کے رُوپوش رہا
موسمِ گُل کی ہوا دارُوئے بے ہوشی تھی
سر اُٹھانے کا بھی سبزے کو نہ کچھ ہوش رہا
نکہتِ گُل کی طرح جامے سے باہر ہوں گا
فصلِ گُل کا جو گلستاں میں یہی جوش رہا
بحرِ رحمت میں بہت ہوگا تلاطم برپا
تجھ کو اے اشکِ ندامت جو یہی جوش رہا
اپنے سر سے بھی کسی روز گزر جائے گا
آبِ شمشیر کو قاتل جو یہی جوش رہا
سایۂ دامنِ قاتل میں جو نیند آئی مجھے
پھر تو کروٹ بھی بدلنے کا نہ کچھ ہوش رہا
دھوم سنتا رہا اب آتے ہیں، اب آتے ہیں
حشر تک میں یونہی کھولے ہوئے آغوش رہا
دُور کھنچتی ہی گئی منزلِ مقصود مگر
رہروِ عشق کی ہمت کا وہی جوش رہا
رحمتِ حق رہی عاصیوں پہ سایہ فگن
سر پہ چھایا ہوا اِک ابرِ خطا پوش رہا
اُٹھتے اُٹھتے تھی وہی بزم کی مستانہ روش
چلتے چلتے بھی خمِ مے کو وہی جوش رہا

پھر گئیں آنکھیں مری کوچۂ جاناں کی طرف
شکر ہے مرتے دم اتنا تو مجھے ہوش رہا
(۱۹۰۴ـ۵ء)

سایہ اگر نصیب ہو دیوار یار کا
کیا مرتبہ بلند ہو اپنے مزار کا
وہ دشتِ ہول ناک وہ حبِ وطن کا جوش
پھر پھر کے دیکھنا وہ کسی بے دیار کا
لَو دے رہی ہے شام سے آج آہِ آتشیں
شعلہ بھڑک رہا ہے دلِ داغ دار کا
تصویرِ نزع دیکھنا چاہو تو دیکھ لو
رہ رہ کے جھلملانا چراغِ مزار کا
پر تولنے لگے پھر اسیرانِ بدنصیب
شاید قریب آگیا موسم بہار کا
مُوئے سفید، کانپتے ہاتھ اور جامِ مے
دکھلا رہے ہیں رنگ خزاں میں بہار کا
انگڑائیوں کے ساتھ کہیں دم نکل نہ جائے
آساں نہیں ہے رنج اُٹھانا خمار کا
ساقی گرا نہ دیجیو یہ جامِ آخری
دل ٹوٹ جائے گا کسی اُمیدوار کا

مستوں کی روحیں بھٹکیں گی، اچھا نہیں ہے اب
گھر گھر کے آنا قبروں پہ ابرِ بہار کا

دیکھو تو اپنے وحشیوں کی جامہ زیبیاں
اللہ رے حُسن پیرہنِ تار تار کا

"جُرمِ گزشتہ عفو کن و ماجرا مپرس"
مارا ہوا ہوں اِس دلِ بے اختیار کا

دنیا سے یاسؔ جانے کو جی چاہتا نہیں
اللہ رے حُسن گلشنِ ناپائدار کا

۱۹۲۷ء

مجموعہ کلام آیاتِ وجدانی سے انتخاب

طبعِ اوّل

من کہ بر نمی تابم دردِ زیستن تنہا
صبح دم چساں بینم شمعِ انجمن تنہا

تا کجا امام یابد از ہجومِ جاں بازار
گوشہ گیرِ فانوسے، بہرِ سوختن تنہا

ہر گلے و ہر خارے فتنہ ہا برانگیزد
الحذر دلِ حیراں صد بہار و من تنہا

ذوق می تواں دانست رنگِ حسنِ نادیدہ
شاہدیست غمازے، بُوے پیرہن تنہا
طرفہ محشرے دارد از فریبِ فردائے
زندہ زیرِ پیراہن، مُردہ در کفن تنہا
اے کہ کارہا کردی، مدفنے مہیا کن
تا بکے نہاں دارد عیبِ من کفن تنہا
چارۂ پشیمانی، خوش دلی و خوش کامی
توبہ از ریاکاراں، خندہا زمن تنہا
رہبرانِ خود گم را، جز دعا چہ فرمایم
پاشکستہ و حیراں، ماندہ در وطن تنہا
ناخدا زمن بگذر سوے دیگراں بنگر
کارِ من بہ دریا در دست و پازدن تنہا
صد رفیق وصد ہمدم پرشکستہ و دل تنگ
وا ہوا نمی نہجد بال و پر بہ من تنہا
نکتہ دانِ خود سازم میرزا یگانہ را
دل نمی تواں برداشت لذتِ سخن تنہا
(۱۹۲۴ء)

ہنوز زندگی تلخ کا مزہ نہ ملا
کمالِ صبر ملا، صبر آزما نہ ملا
مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اُس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

جواب کیا، وہی آوازِ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جاں کاہ مزہ نہ ملا

اُمیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

ہزار ہاتھ اُسی جانب ہے منزلِ مقصود
دلیلِ راہ کا غم کیا، ملا ملا نہ ملا

بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ
کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتا نہ ملا

اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دَیر و حرم، گھر کا راستا نہ ملا

خوشا نصیب، جسے فیضِ عشقِ شورانگیز
بقدرِ ظرف ملا، ظرف سے سوا نہ ملا

سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل
خدا کا ذکر تو، کیا بندۂ خدا نہ ملا

(۱۹۱۹ء)

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گم راہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

ازل سے تیرا بندہ ہوں، ترا ہر حکم آنکھوں پر
مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منھ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

اسیرو، شوقِ آزادی مجھے بھی گد گداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں، کون ہوں، کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

(۱۹۲۳ء)

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے، تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا

پہنا دیا ہے طوقِ غلامی تو، ایک دن
میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا

مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزماؤ گے
راس آئے تم کو جوہرِ شمشیر دیکھنا

آوازے مجھ پہ کستے ہیں پھر بندگانِ عشق
پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا

مُردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت
ہاں دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا

ہوش اُڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھ کر
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا

چونکے تو چشمِ شوق میں عالم سیاہ تھا
خوابِ نظر فریب کی تعبیر دیکھنا

پروانے کر چکے تھے سرانجامِ خودکشی
فانوس آڑے آگیا، تقدیر دیکھنا

شاید خدا انخواستہ آنکھیں دغا کریں
اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
بے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

ہر خوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے
حدِ کمال کاتبِ تقدیر دیکھنا
بادِ مراد چل چکی لنگر اٹھاؤ یاس
پھر آگے بڑھ کے خوبیِ تقدیر دیکھنا
(۱۹۳۱ء)

قہر ہے خانۂ صیاد میں مہماں ہونا
بے گناہوں کے لیے داخلِ زنداں ہونا
لبِ دریا سے غرض ہے نہ تہِ دریا سے
موج و گرداب سے بے دست و گریباں ہونا
لذتِ دردِ سلامت ہے تو آسان نہیں
جان پر کھیل کے آمادۂ درماں ہونا
نفس سے صلح کا انجام یہی ہونا تھا
اپنی ہی سانس پہ رو رو کے پشیماں ہونا
معنیِ وعدۂ موہوم نے صورت پکڑی
بدگمانوں کو مبارک ہو پشیماں ہونا
سہوِ کاتب سے ہے نام اپنا مسلمانوں میں
رنگ لائے گا کسی دن یہ مسلماں ہونا
(۱۹۱۸ء)

قصہ کتاب، عمر کا کیا مختصر ہوا
رُخ داستانِ غم کا اِدھر سے اُدھر ہوا
ماتم سرائے دہر میں کس کس کو روئیے
اے وائے! دردِ دل نہ ہوا، دردِ سر ہوا
تسکینِ دل کو رازِ خودی پوچھتا ہے کیا
کہنے کو کہہ دوں اور اگر اُلٹا اثر ہوا؟
آزاد ہو سکا نہ گرفتارِ شش جہت
دل مفت بندۂ ہوسِ بال و پر ہُوا
دنیا کے ساتھ دین کی بیگار، الاماں!
انسان آدمی نہ ہوا جانور ہوا
فردا کا دھیان باندھ کے کہتا ہے مجھ سے دل
تُو میری طرح کیوں نہ وسیع النظر ہوا
فردا کو دور ہی سے ہمارا سلام ہے
دل اپنا شام ہی سے چراغِ سحر ہوا
(۱۹۲۵ء)

مطبوعہ: ۱۹۳۳

مجموعہ کلام ترانہ سے انتخاب

انا الموجود

جب تک خلشِ دردِ خدا داد رہے گی - دنیائے دلِ ناشاد کی آباد رہے گی

دنیا کی ہوا راس نہ آئے گی کسی کو - ہر رنگ میں جو روحِ عدم آباد رہے گی

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولہ - مٹنے پہ بھی اک ہستیٔ برباد رہے گی

چونکائے گی رہ رہ کے توقع کا فسوں کیا؟ - ساتھ اپنے اجل صورتِ ہمزاد رہے گی

معلوم اپنی ہو کہ یگانہ ہے نشستہ و وزخم - گم ہو کے ہر اک قید سے آزاد رہے گی

کان و وحشت بُنیاں تک آزاد ہیں پابند - ہستی ہے وہ مجموعۂ اضداد رہے گی

دل اور رہِ غم نتائج کو نگاہ قفس میں - شاید یہ زبانِ تشنۂ فریاد رہے گی

خیالوں کو خیالوں فرشتے کا فرشتہ - انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش - دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

مشہور ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا

واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

میرزا یگانہ لکھنوی از عثمان آباد دکن، مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۶ء بروز پنجشنبہ

یگانہ کی تحریر کا عکس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ترانۂ نیم شبی

ساجن کو سکھی منا لو - پھر سو لینا
سوتی قسمت جگا لو - پھر سو لینا
سوتا سنسار سننے والا بیدار
اپنی بیتی سنا لو - پھر سو لینا

(اٹھو سکھی پھر سو لینا)

"ترانہ" مطبوعہ کے متن کا پہلا صفحہ (عکس)

ترانۂ نیم شی

ساجن کو سکھی منالو، پھر سو لینا
سوتی قسمت جگا لو، پھر سو لینا
سوتا سنسار، سننے والا بیدار
اپنی بیتی سُنا لو، پھر سو لینا
(اٹھو سکھی پھر سولینا) (۱۹۳۰ء)

دل کی آواز

دُکھتا ہوا دل ٹٹول لینے والا
آنکھوں آنکھوں میں تول لینے والا
دل کی آواز گوشِ دل سے سُن کر
کیا ہے کوئی درد مول لینے والا؟
(۱۹۳۰ء)

میرا خدا کچھ اور ہے

درد اپنا کچھ اور ہے دوا ہے کچھ اور
ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا ہے کچھ اور
ایسے ویسے خدا تو بہتیرے ہیں
میں بندہ ہوں جس کا وہ خدا ہے کچھ اور
(۱۹۳۱ء)

حجابِ معنی

یوسف کی اِس انجمن میں کیا ڈھونڈتا ہے
ہنگامۂ ما و من میں کیا ڈھونڈتا ہے
نیرنگِ تماشا ہے حجابِ معنی!
تصویر کے پیرہن میں کیا ڈھونڈتا ہے
(۱۹۳۱ء)

معمائے ہستی

کیوں مطلبِ ہستی و عدم کھُل جاتا
کیوں رازِ طلسمِ کیف و کم کھُل جاتا
کانوں تے جو سُن لیا وہی کیا کم ہے
آنکھیں کھلتیں تو سب بھرم کھُل جاتا
(۱۹۲۷ء)

رازِ فردا معلوم

اندھوں کی طرح ٹٹولنا کیا معنی
گونگے کی بولی بولنا کیا معنی
فردا معلوم و رازِ فردا معلوم
پھر پردۂ غیب کھولنا کیا معنی
(۱۹۲۸ء)

دھوکا تو ہی

بدلے گی ہزار رنگ، دنیا تو ہی
بہلاتے ہیں دل ہم بھی، تماشا تو ہی
پردہ ہر دم یوں ہی بدلتا جائے
دھوکا ہے تو ہونے دو، دھوکا تو ہی

(۱۹۲۸ء)

عالم کیا ہے؟

(ایک وسعتِ موہوم کے سوا کچھ بھی نہیں)

صبحِ ازل و شامِ ابد کچھ بھی نہیں
اِک وسعتِ موہوم ہے، حد کچھ بھی نہیں
کیا جانیے کیا ہے عالمِ کون و فساد
دعوے تو بہت کچھ ہیں سند کچھ بھی نہیں

(۱۹۲۷ء)

طلسمِ زندگی

صیادِ ازل کی شعبدہ کاری ہے
آزادی کیا؟ عین گرفتاری ہے

اسرارِ طلسمِ زندگی کیا کہیے
یہ رات کٹی تو کل کا دن بھاری ہے
(۱۹۲۷ء)

❁

حباب اِک ٹھیس کا مہمان ہے

ہر موج ہوا ہے درپے دل شکنی
ہر سانس پہ کرتی ہے قضا خندہ زنی
کھاتا کب تک حباب، دُنیا کی ہوا
وہ ٹھیس لگی کہ دل تو کیا دم پہ بنی!
(۱۹۲۷ء)

❁

Life is a Balance of Opposing Forces

(زندگی ایک ترازو ہے جو متضاد قوتوں کو سادھے ہوئے ہے)

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
اے شمع، تری حیاتِ فانی کیا ہے
جھونکا کھانے، سنبھلتے رہنے کے سوا
(۱۹۳۹ء)

rekhta.org

زندہ دل

دل ہو زندہ تو بارِ خاطر کیوں ہو
درد و غم ناگوارِ خاطر کیوں ہو
باقی ہو دماغ میں اگر بوئے اُمید
پیراہنِ جاں غبارِ خاطر کیوں ہو
(۱۹۲۷ء)

موت کی دوا

حیران ہے کیوں، راز بقا مجھ سے پوچھ
میں زندۂ جاوید ہوں، آ مجھ سے پوچھ
مرتے ہیں کہیں دلوں میں بسنے والے؟
جینا ہے موت کی دوا مجھ سے پوچھ
(۱۹۳۲ء)

مُردہ دل

دل ہو مُردہ تو زندگانی بھی حرام
پیری کا ذکر کیا، جوانی بھی حرام
افسانۂ عمرِ جاودانی بھی حرام
آبِ حیواں کہاں کا؟ پانی بھی حرام
(۱۹۲۷ء)

مطبوعہ: ۱۹۴۷ء

مجموعہ کلام گنجینہ سے انتخاب

غزل

ارے واہ صلح ہوئی تو کیا، وہی آگ دل میں بھری رہی
وہی خُو رہی، وہی بُو رہی، وہی فطرتِ بشری رہی

وہی بندگی، وہی صاحبی، وہی راج اور وہی راج ہٹ
نہ جوابِ تلخ کا حوصلہ، نہ مجالِ فتنہ گری رہی

وہی نیستی، وہی شامتیں تو کہاں کی عید، کہاں کی دید؟
شبِ غم کی صبح ہوئی تو کیا وہی غفلتِ سحری رہی

کوئی رازِ درد چھپائے کیا کہ یہ دردِ دل ہے بُری بلا
دمِ واپسیں بھی زبان کو وہی فکرِ پردہ دری رہی

نگہِ کرم کا سوال کیا ہے، عتاب کی بھی خبر نہیں
ترے سنگِ در پہ جبینِ شوق دھری رہی سو دھری رہی

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر، اسے عیب جانیے یا ہُنر
وہی بات آئی زبان پر جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی

یہ بلائے حُسن کہاں نہیں مگر اپنے واسطے قحطِ حُسن
تمھیں کیا بتائیں نظر کے ساتھ جو زحمتِ نظری رہی

کوئی چشمِ شوق کے سامنے ہو تو سُوجھتی ہے نئی نئی
ترے دم قدم کی بہار تھی کہ طبیعت اپنی ہری رہی

کوئی میری آنکھ سے دیکھتا وہ زوالِ دولتِ رنگ و بُو
کہ بہارِ حُسن کی شام کو بھی عجیب جلوہ گری رہی
کوئی آرزو تھی چھپی ہوئی، کوئی اقتضا تھا دبا ہوا
دلِ مضطرب میں جبھی تو اک خلشِ شکستہ پری رہی
وہ گناہ گار ہمیں تو ہیں کہ جمالِ پاک کے سامنے
نظر اُٹھتے اُٹھتے جھپک گئی، ہوسِ گناہ دھری رہی
عجب اتفاق، بھڑک اُٹھی وہ نشے میں دوست کی دشمنی
ارے اِس حقیقتِ تلخ سے مجھے کیوں نہ بے خبری رہی
یہ وہ دل ہے جس میں سوائے حق کسی دوسرے کا گزر نہیں
وہی ایک ذاتِ یگانہ بس، وہی ایک جلوہ گری رہی
(۱۹۳۶ء)

رباعیات

فطرت کچھ اور ہے خدا ہے کچھ اور
بالغ نظروں کا منتہا ہے کچھ اور
جس کے دَم سے ہے دل کی دنیا روشن
اُس جاگتی جوت کے سوا ہے کچھ اور
(۱۹۳۶ء)

تازہ مُژدہ کوئی سُناتا ہے تو آ
اُجڑے گھر کو مرے بساتا ہے تو آ

پھر بند نہ ہو جائے کہیں دل کا کواڑ
ایسے میں سویرا ہے، آتا ہے تو آ
(۱۹۲۷ء)

ترسی ہوئی آنکھوں کا تقاضا ہے تو کیا
پھوٹی ہوئی آنکھوں کی تمنا ہے تو کیا
اُترے گا کبھی نہ حُسنِ بے رنگ کا عکس
روشن ہے تو کیا، آئنہ اندھا ہے تو کیا
(۱۹۳۶ء)

دُنیا میں رہ کے راست بازی کب تک
مشکل ہے، کچھ آساں نہیں سیدھا مسلک
سچ بول کے کیا حُسین بننا ہے تجھے
اتنا سچ بول، دال میں جیسے نمک

کیا بھانپتا ہے بھانپنے والے باز آ
حیران ہے کیوں، ناپنے والے باز آ
کھنچتی جائے گی اور بھی دُور سے دُور
آفاق کی حد ناپنے والے باز آ
(۱۹۳۵ء)

نظارۂ بیدار بھی مہمل ٹھہرا
ہے ایک سے بڑھ کے ایک پردہ گہرا
افسانۂ شاہد حقیقت باطل
کہتا گونگا ہے اور سنتا بہرا
(۱۹۳۶)

کس منہ سے کہے کوئی کہ تُو ایسا ہے
ویسا تو نہیں ایک بھی، تُو جیسا ہے
ہاں ہے تو سہی مگر نہ جانے کیا ہے
ایسا نہیں، ویسا نہیں، پھر کیسا ہے؟

اِن عقل کے اندھوں میں ہے یہ غُل کیسا؟
میں جُز ہوں وہ کُل ہے، یہ تعقّل کیسا؟
کُل ہی کُل ہے کہاں کا جُز کیسا جُز
جُز کُل سے الگ ہوا تو پھر کُل کیسا؟

منزل کی جستجو میں گم رہتا ہوں
ہنگامۂ آرزو میں گم رہتا ہوں
اُمید کا سبز باغ، اے صلِّ علیٰ
اِک عالمِ رنگ و بو میں گم رہتا ہوں
(۱۹۳۴ء)

مرتبہ: ۱۹۵۱ء

مجموعہ کلام گنجینہ سے انتخاب

قلمی / غیر مطبوعہ / بخطِ یگانہ

یگانہ آرٹ

(رباعیات)

اِک وہ کہ پھرا کرتے ہیں اکڑے اکڑے
اِک ہم کہ شکنجے میں پڑے ہیں جکڑے
بے چارہ جو درد سے ہو یوں دست بہ دل
کس ہاتھ سے ظالم کا گریباں پکڑے؟
(۱۹۵۰ء)

کیوں مجھ پہ توجہ ہے، خدا خیر کرے
ناکردہ گنہ گار بھی بے موت مرے
جن کی کوئی پُرسش ہی نہ ہو، ایسوں سے
کرتا بھی ڈرے اور نہ کرتا بھی ڈرے

وہ مستِ شباب یاد آتا کیوں ہے
امکانِ ہوس کو آزماتا کیوں ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ مرے پاس آ جا
پرچھائیں سی پردے پہ دکھاتا کیوں ہے؟
(۱۹۳۸ء)

❁

کیوں ذوقِ نظر، طعنۂ غفلت سہتا
جی میں اپنے نہ جانے وہ کیا کہتا؟
جب حسن و شباب ہو سراپا دعوت!
دل کو کب تک کوئی مسوسے رہتا؟

❁

کیوں ساری خدائی میں اب اندھیر نہ ہو؟
ایمان پلٹتے بھی کوئی دیر نہ ہو؟
جاتی رہے بھوک پیاس، جلوہ ایسا!
دیکھے تو کبھی چشمِ ہوس سیر نہ ہو!
(۱۹۵۱ء)

❁

بھوکا تیرا کبھی نہیں چھکنے کا
انداز تو دیکھے کوئی منھ تکنے کا!
کیوں کر ممکن ہے حُسن سے مُنھ پھیرے؟
مارے سے کبھی دل نہیں مر سکنے کا

ہر رنگِ شباب اپنی طرف کھینچتا ہے
ہر حسنِ حجاب اپنی طرف کھینچتا ہے
آپ ایسے کہ جنبش نہیں کرتے، ورنہ
ہر دامِ سراب اپنی طرف کھینچتا ہے

کھلتے ہیں علم سے بشر کے جوہر
پاکیزہ سرشت و بدگہر کے جوہر
جب اٹھ گیا پردۂ جہالت، ناداں
کھلتے پھر کیوں نہ خیر و شر کے جوہر؟

عاشق ہی نہیں ہوس کے بندے بھی تو ہیں
آنکھوں کے سواء عقل کے اندھے بھی تو ہیں
اِک وہ ہیں کہ دوست سے گلے ملتے ہیں
پرچھائیں پہ دوڑتے ہیں، ایسے بھی تو ہیں

گزرا ہوا وقت ہاتھ کیوں کر آئے
پودا مرجھا گیا تو پھل کیا لائے
کب تک جھوٹی تسلیوں کی خاطر
چوکا اِک بوند کا گھڑے ڈھلکائے؟

افسانۂ حُسن و عشق دُہرا لینا
بچوں کی طرح سے دل کو بہلا لینا
کیا کیجیے اب وقت کچھ ایسا آیا
خالی ٹل ٹل کے ہاتھ گرما لینا

نغمہ بھی کوئی وجد میں لاتا نہیں اب
کیسا ہی مزہ ہو دل کو بھاتا نہیں اب
اللہ اللہ یہ وقت بھی آ پہنچا
پیاری صورت پہ پیار آتا نہیں اب

بازار میں جب کوئی بھی گاہک نہ رہا
دُکھتے دل سے کسی نے کیا خوب کہا
آغاز وہ تھا، حُسن کا انجام یہ ہے
ساری وہ رنگ و بُو ہوا ہوگئی، ہا!
(۱۹۵۰ء)

کچھ کام کرو کہ چارۂ غم ہے یہی
زخمِ دلِ ناکام کا مرہم ہے یہی
اللہ سے لو لگائے بیٹھے کیا ہو؟
شیطاں سے نپٹ لو کہ مقدم ہے یہی
(۱۹۵۰ء)

مردانِ عمل کو اجر کی پروا کیا
خود ذوقِ عمل اجر ہے، اندیشہ کیا
دنیا میری بلا سے خوش ہو کر نہ ہو
میں اپنے سے خوش ہوں تو غمِ دنیا کیا

آپ اپنی جگہ جو شرم سے گڑ جائے
اُس پر بھی کوئی ترس نہ تجھ کو آئے؟
میرا تو خدا ایسا نہ ہو گا بخدا
بندے کی خطا بندے کے مُنھ پر لائے

زمزم سے گناہوں کا ہے دھونا اچھا
یا خوف عذاب سے ہے رونا اچھا
مہمل ہے یہ سب، دل تو یہی کہتا ہے
دوزخ میں گھس کے پاک ہونا اچھا

بوسیدہ عمارت پہ کہاں تک کہگل؟
سودائے عمل ہے یہ کہ فکرِ باطل؟
کیوں حال سے بیزار ہو، کیا چاہتے ہو
ماضی سے بندھے سلسلۂ مستقبل؟

باقیات سے انتخاب

مقدر کے کرشمے ہیں، خطا کیسی، سزا کیسی
مجھے اپنے کیے پر پاسِ شرمانا نہیں آتا
(۱۹۲۴ء)

اجل کے واسطے خالی نہیں مکاں اپنا
ہے ایک دشمنِ جاں آج میہماں اپنا
(۱۹۱۶ء)

کیا خوب اُلٹے پاؤں جوانی پھر آگئی
دیکھو نہ میرا شعر جوانوں سے لڑ گیا
دامِ خرد سے چھوٹ کے پہنچا مُراد کو
دیوانہ بن کے قیس بنا یا بگڑ گیا
شیطان کا مقابلہ کیا عشقِ پاک سے
لڑنے کو لڑ پڑا مگر آخر پچھڑ گیا
(۱۹۳۱ء)

"رباعی"

شاہوں سے مری کلاہ ٹیڑھی ہی رہی
بدمغزوں سے رسم و راہ ٹیڑھی ہی رہی
ٹیڑھے مرزا کو کون سیدھا کرتا
سیدھی نہ ہوئی نگاہ ٹیڑھی ہی رہی

بے کار ہے اے دوست زمانے کا گلہ
دیتے ہیں بہادر ہی بہادر کو صلہ
حاصل ہے کسے عزت و ذلت کا شرف
جو لکھنؤ کے ہاتھ یگانہ کو ملا

غزل

سب ترے سوا کافر، آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبط مذہب کیا
چلو بھر میں متوالی، دو ہی گھونٹ میں خالی
یہ بھری جوانی کیا، جذبۂ لبالب کیا
سب جہاد ہیں دل کے، سب فساد ہیں دل کے
بے دلوں کا مطلب کیا اور ترکِ مطلب کیا
ہو رہے گا سجدہ بھی جب کسی کی یاد آئی
یاد جانے کب آئے زندہ دارئ شب کیا

غزل

جان پیاری ہے، حیاتِ جاوداں پیاری نہیں
زندگی کیا، موت کی جب گرم بازاری نہیں
صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائے گا داغ
دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں
دیکھتے ہی دیکھتے بدلا زمانے کا یہ رنگ
پھولوں میں خوشبو، حسینوں میں وفاداری نہیں
جھیل لیں گے ہجر کے مارے قیامت کا بھی دن
آج کی شب تو کٹے پھر کوئی دشواری نہیں

غزل

کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اُجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے
بے دلوں کی ہستی کیا، جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
خواب ہے نہ بیداری ہوش ہے نہ مستی ہے
کیمیائے دل کیا ہے، خاک ہے مگر کیسی
لیجئے تو مہنگی ہے، بیچئے تو سستی ہے
کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا
فکر کی بلندی یا حوصلے کی پستی ہے
حسن بے تماشا کی دھوم کیا معما ہے
کان بھی ہیں نامحرم، آنکھ بھی ترستی ہے
چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے

منتخب اشعار

یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

الٹی تھی مت زمانۂ مُردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

یگانہ میر وہی ہے جو پہلے مار چلے
جو ٹھن گئی ہے تو اب تابِ انتظار نہیں

اندھا ہے اندھا، لیلیٰ ہے لیلیٰ
مشاطہ چاہے جتنا سنوارے

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا قافلہ دل کا

کدھر چلا ہے، ادھر ایک رات بستا جا
گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی
کہیے کیا بات دھیان میں آئی
علم کیا علم کی حقیقت کیا
جیسی جس کے گمان میں آئی

اب اپنے ختم سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں
جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

غزل

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا
اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا
کسی کے روپ میں تم بھی تو اپنے درشن دو
جہاں میں شاہ و گدا رنگ لائے ہیں کیا کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
گزر کے آپ سے ہم آپ تک پہنچ تو گئے
مگر خبر بھی ہے کچھ پھیر کھائے ہیں کیا کیا
بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا
خدا ہی جانے یگانہ، میں کون ہوں، کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

دیوان غالب

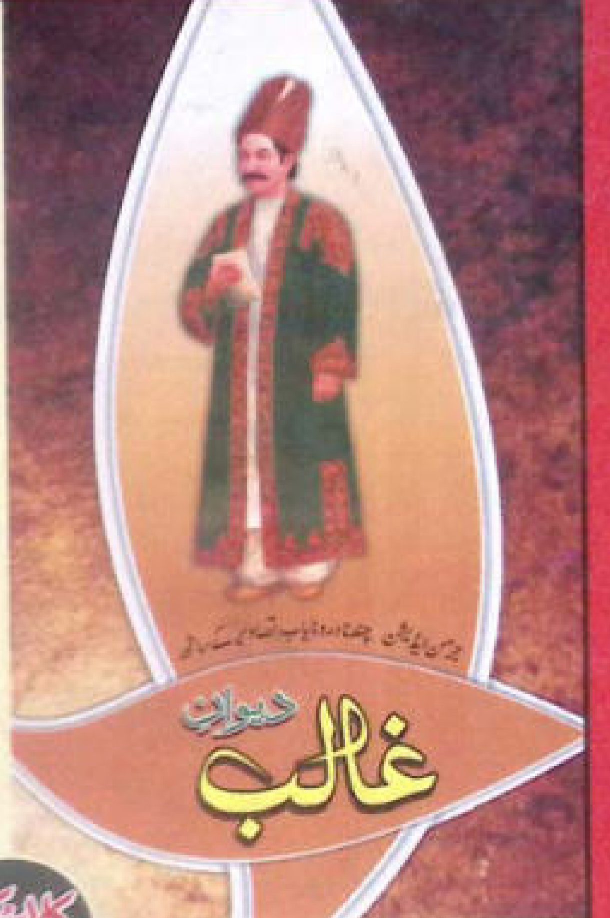
جرمن ایڈیشن بڑے

سائز میں نادر و نایاب

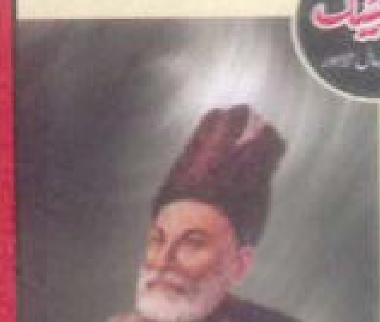
رنگین تصاویر کے

ساتھ پہلی بار

مجلد اعلیٰ: قیمت:- 450/ روپے



کلاسیک



مطابق اصل

جرمن ایڈیشن

دیوان غالب

مجلد اعلیٰ: قیمت:- 150/ روپے